

اے حمید

برف پاری کی رات



چنانچہ ایک روز ہم نے سامان باندھا اور مری کی طرف چل پڑے۔

ہم چار یار تھے۔ میں، احمی، خواجہ اور ماؤزی تنگ..... جس کا اصلی نام ملک غلام حسن تھا۔ لیکن جینی لیڈر سے غضبناک مشابہت کے باعث ہم سب یار اُسے ماؤ کہا کرتے تھے۔ گنجی چندیا کے اطراف میں کھڑے کھڑے برش منا بالوں کی سباج، گول مٹول چہرہ، پھیکے شلغم ایسی چھائیوں بھری کھال چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں جیسے گرم پانی میں ابالی گئی ہوں۔ جب وہ بد نما پیلے دانت نکال کر ہنستا تو آنکھیں اندر کو چھپ جاتیں اور مسوڑھوں کا لال لال گوشت صاف نظر آنے لگتا۔ ڈھیٹے ڈھالے بد وضع کپڑوں میں ملبوس رہتا۔ چلتے وقت پاؤں اندر کو پڑتے، اور کندھے بھالو کی طرح دائیں بائیں ہلا کرتے۔ قمیض کے دو بٹن ہمیشہ کھلے رہتے جو سینے پر اُگے ہوئے گھنے سیاہ بالوں کے جنگل کو ہوا دیا کرتے۔ ناٹے قد اور مضحکہ خیز شکل و صورت والا ہمارا دوست ماؤ لاہور ریلوے ہیڈ کوارٹر کے دفتر میں سینئر کلرک تھا۔ چار بچوں کا باپ تھا۔ عورتوں کے ذکر کے ساتھ ہی اس کی زبان سے پٹنارے کی سی آواز نکلتی اور آنکھوں میں پانی بھر آتا صنف لطیف کے ساتھ اس کے ایسے کرخت اور حیوانی لگاؤ سے مجھے بڑی کراہت ہوتی تھی۔ ایک بار میں نے اُسے کہا۔

تم عورت کے تقدس کو مجروح کر رہے ہو عورت ایک عظیم صنف ہے۔

اس پر ماؤ نے زور سے قہقہہ لگایا۔ میں یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ جب ماؤ قہقہہ لگا کر ہنستا ہے تو اس کی آواز بالکل نہیں نکلتی۔ بس اس کا منہ کھلتا ہے۔ آنکھیں اندر کو گھستی ہیں

لیکن اس کے ساتھ ہی ماد میں کچھ اور باتیں بھی ہیں جو بڑی دلچسپ ہیں۔ وہ بڑی صوفی فوراً اس کی گنجی چند یا پرچیت لگا کر چیخ اٹھتا ہے۔ ترتیب اور اصول سے کھتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر وہ کراچی سے لاہور آ رہا ہو تو فوراً ”بند کرو اس دھرم کو“

مومن کا شخص استعمال کر جاتا ہے جس کی وجہ سے اچھی خاصی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ شعر بھی دیا
 عموماً بے وزن اور غلط سلط کتا ہے۔ لیکن ایک شے جو قدرت نے اُسے دے رکھی کئی کر لوں گا۔

ہے وہ ہے قصہ سنانے کا فن، داستان گوئی میں اس کا ہمسر پیدا نہیں ہو سکا۔ اُسے لیکن اس کا کیا کیجئے کہ اگلے سال وہ اور زیادہ کنجوس ہو جاتے ہیں۔ انھیں سگریٹ پوری الف لیلا اور داستانِ امیر حمزہ ازبر ہے۔ یہاں اس کا حافظہ اس کی ہر قوت کی بالکل عادت نہیں ہے۔ مگر جب کسی دوست کی ڈیا کھل جائے تو وہ سگریٹ کے مات دے گیا ہے۔ جب وہ موج میں اگر الف لیلا کے کسی دل پھینک خوبصورت شہزادہ ساتھ سگریٹ سدا کر پیتے ہیں۔ مشروب سے انھیں سخت نفرت ہے لیکن جب کوئی کی داستان سنانے لگتا ہے تو محض پرستار اچھا جاتا ہے، اور لوگ اپنا سانس روک لیتے "دست لے آئے تو آؤٹ ہو کر جوتے سے اپنا سر کوٹنے اور اپنے آپ کو ملامت ہیں۔ ماؤ کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ ایک ہاتھ فضا میں بلند ہو جاتا ہے۔ آواز کبھی نفرتی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کا چہرہ صفا چٹ ہے۔ گھی کھڑی بالوں والے چھوٹے سر پر گھنٹوں کا روپ بدلتی ہے، کبھی شیر کی دھاڑیں جاتی ہے، اور کبھی خشک پتوں پر جھونک کی وقت سے پہلے توڑے ہوئے ادھ پکے کدو کا گمان ہوتا ہے۔ جسم بوجھل اور توند چھو لی سرسراہٹ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ موٹی عورتوں کے عشق میں ناکام ہو کر صحرانوں کی خاک ہوئی ہے۔ دوستوں کے پان کھا کھا کر دانت خراب ہو چکے ہیں۔ چہرے پر لجاجت پھانسنے والوں کے جذبات کی عکاسی وہ بڑی مہارت سے کرتا ہے۔ ان دل جلے عاشقوں اور عیارانہ بستم ہر وقت عیاں رہتا ہے، دیکھنے میں بڑے بھولے بھالے بیضر اور بدھو کا حال زار وہ اپنا حال سمجھ کر بیان کرتا ہے۔ دینے بھی اس کے قصے کی ہر عورت موٹ لگتے ہیں۔ حقیقت میں بڑے موقع پرست اور اپنی غرض کے دیوانے ہیں۔ نئے آدمی

سے متعارف ہوتے وقت بلجیا سا ہاتھ ملا کر بالکل موم سے ہو کر جھک جاتے ہیں۔ کتابوں کی چھوٹی سی دکان ہے رنگ گہرا سا نولا ہے۔ جسم تیلہا ہے مگر قد کاٹھ کشمیریوں کی طرح چوڑا چمکا ہے۔ بھوؤں کے بال بڑے گنجان ہیں اور بچھو کے ڈنک کی طرح پیشانی بے تنگی ہانکنے اور ہر بات، ہر موضوع میں ٹانگ اڑانے کے عادی ہیں۔

لاہور میں بھی صوفی صاحب ایک ٹوٹا پھوٹا ہوٹل ہی چلاتے ہیں جو انہوں نے اپنا دھنڈا رکھا ہے۔ ایک دن ہم سب دوست ان کے پاس کاؤنٹر پر بیٹھے تھے کہ ایک سفید برقع پوش عورت آئی اور اس نے صوفی سے آٹھ آنے مانگے صوفی نے اس کاؤنٹر کے تمام دروازے کھول کر دکھائے اور بولے:-

”قسم لے لو جو ایک پائی بھی ہو۔“

جب عورت بے نیل و سراپا واپس چلی گئی تو صوفی جیب سے اٹھنی نکال کر اس سے کھینے لگے۔ ہم نے پوچھا:-

”کون تھی یہ عورت؟“

مسکرا کر آہستہ سے بولے:-

”میری ماں تھی۔“

آپ کو جب علم ہوا کہ ہماری ٹولی کوہ مری آرہی ہے اور قمر ہوٹل سلورکنگ کے نام نکلا ہے تو آپ نے فوراً ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعے ہماری آمد پر خوشی کا اظہار کیا، اور آخر میں صرف اتنا لکھ دیا کہ ہم سے کمروں کا کرایہ نصف لیا جائے گا ماؤ نے حکم لہرا کر کہا۔

”اس کمینے کی یہ مجال کہ ہم سے کرایہ لے۔ اس نے ہمیں سمجھ کیا رکھا ہے۔ ہم پھر اچانک حملہ کر دیتا ہے۔ اس کے ہوٹل میں آگ لگا دیں گے۔“

ہمارے نندے دوست خواجہ دلگیر صاحب نے بڑی متانت سے عید کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا:-

”میرا خیال ہے ہمیں ایک ہی کمرے میں ڈیرا جمانا چاہئے۔“

خواجہ دلگیر جسے ہم سب دوست صرف خواجہ ہی کہتے ہیں۔ بڑا سنجیدہ اور متین نوجوان ہے۔ شادی ابھی نہیں ہوئی لاہور میں کاپی پینسل سٹیٹوں اور پرانی

پر اوپر کو اٹھے رہتے ہیں۔ دبیلے جسم کی چمک منگ باگر بلوں ایسی ہے۔ بہت کم بولتے ہیں۔ بہت زیادہ سگریٹ پیتے ہیں۔ شراب کھاتے ہیں لگاتے ان کی مثال بالکل اس مکرے کی طرح ہے جس کی ساری محنت باریک ریتوں کا خطرناک جال بننے میں صرف ہوتی ہے۔ مکرے کی طرح خواجہ دلگیر کے منہ سے، ہاتھوں سے جسم کی متین اور سنجیدہ حرکات سے غیر محسوس طور پر غیر مرئی باریک نظر نہ آنے والے ریشے ہر لمحہ نکلتے رہتے ہیں اور ایک خطرناک جال اپنے آپ بنا چلا جاتا ہے۔ پھر جال بن کر تیار ہو جاتا ہے تو خواجہ ایک کونے میں اپنی لمبی لمبی نوکیلی ٹانگیں سمیٹے دبک کر بیٹھ جاتا ہے۔ جونہی کوئی شکار جال میں الجھتا ہے خواجہ لپک کر اس پر چھٹتا ہے، اور ان کی آن میں اُسے چٹ کر کے ہڈیوں کا ڈھچھر نیچے پھینک دیتا ہے۔ خواجہ کی بھولی ہوئی ناک پر باریک گمانی کی عینک ہر دم چڑھی رہتی ہے۔ عینک ایک لفظ اتر جائے تو آپ کو بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ سگریٹ خود بنا کر پیتا ہے، اور دوسروں کو بھی بنا کر دیتا ہے۔ عورتوں کے ساتھ اس کا رویہ بڑا دھما، پر اسرار اور خطرناک ہوتا ہے۔ صنف نازک کے سامنے بیٹھ کر وہ بڑے اطمینان سے انگلیاں چٹھتا ہے اور سگریٹ بنا بنا کر پیتا رہتا ہے۔ کچھوے کی طرح وہ بڑی موقع شناس کاہلی سے دھیرے دھیرے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، اور پھر اچانک حملہ کر دیتا ہے۔

ہمارا چوتھا یارا اچھی لاہور کے ایک مشہور نابنائی کاڑھ کا تھا جس کی شہر کے صدر بازار میں بیکری کی دکان تھی۔ تین بار میرٹک میں قیل ہونے کے بعد جب اس کے باپ نے لاڈلے بیٹے کو بیکری کے دھندے میں لگا دیا، تو ڈیل روٹیاں کاٹتے کاٹتے نازک مزاج اچھی کی انگلیاں دُکھنے لگیں چنانچہ اس نے ایک سال تک تو چمڑے کے ایک مقامی تاجر کی دکان پر جُزوقتی منشی گیری کا کام کیا، وہاں سے بھاگ کر فینائیل اور تارپین بنانے والی ایک فیکٹری میں ٹائم کیپر ہوا ریاں جی نہ لگا تو ایک ریٹائرڈ ہیڈ

کلرک کے بچوں کو اردو اور حساب پڑھانے پر لگ گیا۔ پہلے ہی روز ہیڈ کلرک کی زرد روٹ کھٹ لڑکی سے آنکھ لڑ گئی۔ حساب کی کتابوں اور کتابیوں کے ذریعے رفته بازی شروع ہو گئی، ایک روز دونوں عاشق و معشوق میٹرھیوں میں کھڑے مشغول تھے کہ ہیڈ کلرک نے دیکھ لیا۔ اچھی نے ایک ہی جہت میں چھ میٹرھیاں پار کر کے دروازہ کھولا اور باہر نکل بھاگا۔ اس کے بعد اس نے شہر کے اس علاقے کا کبھی رخ نہ کیا۔ آج کل اس کا کام کبھی کبھی خالی وقت میں ٹائپ سیکھنا۔ باپ کی گدی پر بیٹھ کر سگریٹ پیل پڑے۔

ماؤ کے پاس نصف ٹکٹ کاریلوے پاس تھا۔ ہم رات کی گاڑی سے روانہ چائے کا خرچ اڑانا اور صبح وشام لڑکیوں کے کالج کے پاس بس سٹاپوں پر بیٹھ لانا۔ اچھی کا رنگ گورا اور جسم دھلا تھا، ناک مٹری جوتی تھی اور چہرے پر نسواری رنگ کے بے شمار تیل تھے اُسے صرف کپڑے پہننے اور لڑکیوں کو عاشقانہ خطوط لکھنے کا شوق تھا۔ اس کے پاس کئی ایک لڑکیوں کے محبت بھرے خطوط تھے۔ جنہیں اس نے تصویر لڑائی شروع کر دی۔ سارا راستہ بڑے مزے سے کٹا۔ جہلم سے پنڈی تک ماؤ نے اس کی طرح ایک سبز رنگ کی جلد والی البم میں لگا رکھا تھا۔ یہ البم وہ اپنے ہر دوست کی تصویر لڑائی شروع کر دی۔ کسی مسافر کو سونے نہ دیا۔ پھر اس نے پہلی جنگ عظیم کے کو دکھانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کی کبھی ہوئی آنکھوں کی سیلی رنگت بڑی خطرناک تھی۔ بظاہر اس کے چہرے میں کوئی کشش نہ تھی۔ لیکن آنکھوں کی اس سیلی رنگت میں بلا کا جادو تھا۔ ایک عجیب قسم کی بے بسی عاجزی، مکاری، اور کراہت کا ملا جلہ احساس تھا جو خواجہ دیگر کے خیال میں عورتوں کے لئے اسم اعظم کا درجہ رکھتا ہے۔

کوہ مری کی سیر کا پروگرام اچانک بن گیا۔ صوفی کی بد قسمتی کہ اُس نے مری میں جا کر ہوٹل سلورنگ کا ٹھیکہ لے لیا اور پھر ہسٹل کارڈ بھی ڈال دیا۔ دراصل خط اس نے اپنی برتری جتانے کے لئے لکھا تھا کہ اب سارا سیزن مری کی ٹھنڈی ہواؤں میں رہے گا، اور ہمیں جولاہور کی گرمی میں جھلس رہے ہوں گے۔ یاد کر کے خوش ہوا کرے گا۔ ماؤ نے خط پڑھنے کے بعد زور سے ناک صاف کر کے اعلان کر دیا کہ ہمیں اس حرام زادے کی خبر لینی چاہیے۔ لہذا ہم کوہ مری کی طرف کوچ کر دینا چاہیے۔ پروگرام تو بن گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ رقم کہاں بار بار منہ پونچھتے ہوئے گرمی کو کوس رہا تھا۔ خواجہ جیب سے زمبک مرہم کی سے پیدا کی جائے۔ ماؤ نے اپنے ریلوے کے دفتر سے پندرہ یوم کی رخصت مالی ڈبی نکال کر سگریٹ بنانے لگا۔ تو ماؤ نے پٹھانہ انداز میں ہاتھ جھٹک

گاڑی راول پنڈی پہنچی تو دن چڑھ آیا تھا۔ مری جانے والی بس صدر جا رہی تھی۔ دھوپ بڑی تیز تھی اور گرمی کے مارے دم نکلا جا رہا تھا۔ ماؤ پسینے میں نہاٹا رہا تھا۔ کھلے گریبان میں سے سیاہ بالوں کا جنگل باہر کو اُڑ رہا تھا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ رقم کہاں بار بار منہ پونچھتے ہوئے گرمی کو کوس رہا تھا۔ خواجہ جیب سے زمبک مرہم کی سے پیدا کی جائے۔ ماؤ نے اپنے ریلوے کے دفتر سے پندرہ یوم کی رخصت مالی ڈبی نکال کر سگریٹ بنانے لگا۔ تو ماؤ نے پٹھانہ انداز میں ہاتھ جھٹک

کر کہا۔

”ارے لعنت ہے تم پر... اتنی گرمی میں بھی باز نہیں آتے سگریٹ پینے

سے“

خواجہ خاموشی سے ہنسا رہا۔ اچھی نے گودن پر رومال بھیرتے ہوئے کہا۔

”لایا رخواجہ ایک میرے لئے بھی“

ماؤ نے تیلون کے اندر سے قمیض باہر کھینچتے ہوئے کہا۔

”پہاڑ کے خیال سے زیادہ گرمی لگ رہی ہے کوئی نہیں۔ ابھی کوئی دم

میں ٹھنڈی ہوائیں بوس و کنار کر رہی ہوں گی۔“

۲
سلور کنگ ہوٹل کے کاؤنٹر پر بیٹھے بیٹھے کنجوس صوفی نے ہماری ٹولی کو سامان
مزدوروں کے سروں پر رکھوائے اقبال دخیزاں سڑک کی چڑھاتی چڑھتے دور
ہی سے دیکھا اور اس کا رنگ اڑ گیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر اندر گیا۔ میبل کیسلی
وردی پوش لوکروں کے پاس جا کر پھولی ہوئی توڈر پر ہاتھ مار کر بولا:-

”کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔ وہ میرا مال کھانے والے میرے سوتیلے آگئے ہیں“
اس کے بعد اس نے پاگل ریچھ کی طرح خرخراتے ہوئے کمرے کے دوہیں
چکر کاٹے اور باہر کاؤنٹر پر آ گیا۔ ہماری ٹولی اس وقت ہوٹل کے باہر پہنچ چکی
تھی؛ اور مزدور سامان رکھ رہے تھے۔ ماؤ نے جواب خاکی رنگ کا گرم منظر اڑھے
تھا دونوں ہتھیلیاں ملتے ہوئے کہا۔

”ارے یہاں کیوں رکھ رہے ہو اوپر لے جاؤ..... کیوں بھی صوفی کون

ساکرہ ہے؟“

صوفی بیٹسی کھول کر بڑے عیارانہ مخصوص تبسم کے ساتھ ہم سب کو ملا

”واہ واہ! خوب رونق رہے گی۔“

خواجہ نے کہا۔

”خوب مزار ہے گا پیارے۔ تمہارا مال کھائیں گے اور اپنوں کی روح کو

ثواب پہنچائیں گے۔“

صوفی اب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ نادر شاہ کی فوجیں رنگیلے کے محل میں داخل ہو چکی تھیں۔ کھستانی سی ہنسی ہنس کر بولا۔

”دکھاؤ پیار دکھاؤ۔۔۔ دوستوں سے بڑھ کر کوئی شے پیاری نہیں۔“

اجی نے ماؤ کو کہنی ماری۔

”یہ تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ تم کمروں کے نمبر بتاؤ۔“

”ہیں تمہاری سمولت کے لئے ایک پورا ہال کمرہ ریزر کر دیا ہے۔ اس کمرہ

میں آگ جلانے کی انگیٹھی بھی ہے۔“

صوفی جسے ہاں کمرہ کہہ رہا تھا، وہ ہوٹل سلورکنگ کی دوسری منزل پر ایک سوٹوروم تھا، جو کاٹھ کباڑ سے بھر پڑا تھا، اور سیلن اور جلی ہوئی لکڑی کی ٹیلا بواٹھ رہی تھی ماؤ صوفی کو گایاں دینے لگا۔

حرامزادے! ہم کوئی مفت خور سے ہیں، جو اس چڑیا گھر میں رہیں۔ کیسے! ہم تجھے کرایہ دیں گے۔“

صوفی ہنسنے اور توند پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

”ارے یار وگرم کیوں ہوتے ہو۔ ایسا ابل نمبر کمرہ سارے ہوٹل میں

میں اسے ابھی صاف کروائے دیتا ہوں۔ ارے رنجو۔۔۔۔۔ ادھر آ بے۔۔۔۔۔

صفائی کے بعد کمرے کی بدبہشتی اور بے ڈھنگا پن اور زیادہ نمایاں ہو گیا

اس کی دیواریں کتر زدہ تھیں چھت سے جالے لٹک رہے تھے۔ کونے میں

کو بھینگر بولتے اور دن کو چھپکیاں رنگا کرتیں۔ آتشزدہ کی لہ نیٹیں ڈھے چکی تھیں

اور دیوار دھوئیں سے کالی سیاہ ہو کر باہر کی روشنی میں لشک رہی تھی۔ جب کمرہ

کا کوڑا کرکٹ ہٹایا گیا تو نیچے سے ایک جھلنگا پٹنگ نمودار ہوا۔ جس کی چولیس ہاتھ

لگانے سے ہی بول اٹھتیں۔ ہم چاروں میں اس بات پر جھگڑا شروع ہو گیا کہ پٹنگ

پر بستر کون جھائے؟ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ پٹنگ آخر پٹنگ تھا اور زمین سے تو

رہے بستر تھا۔ آخر طے ہوا کہ ہر آدمی ایک رات اس پر سویا کرے پہلی رات ماؤ نے انتخاب کر لی۔ اُس نے بڑے ٹھٹھے سے اس پر اپنا بستر جما دیا۔ آہنجی کیس میں سے شیو کا سامان لوٹا ہوا گول آئینہ، کنگھی، اکریچ کی ٹیشی، تیل اور جاسوسی ناولوں کا پینڈ نکال کر اُسے گرد آلود کالرس پر رکھ دیا۔ ہم لوگوں نے بھی مجبوراً اپنے بستر سے فرش پر بچھا دیئے۔ اب ہر شخص بڑے زور شور سے واٹرھی بنانے لگا۔ میں باہر بالکونی میں آ گیا۔ بالکونی کیا تھی دیمک زدہ پرانی لکڑی کی ایک چنان تھی جس کے آگے بانس کی باڑھ لگا دی گئی تھی۔ سامنے جھونپڑی نما مکانوں کا سلسلہ تھا جس کی جھکی ہوئی دیواروں کی کھڑکیاں ہماری طرف کھلتی تھیں۔ نیچے گلی تھی جس میں سارے ہوٹل کا کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا۔ اور جس میں سے طرح طرح کی بدبو اُٹھ رہی تھی۔ کیس سے پانی کے مسلسل گندی نالی میں ٹپکنے کی صدا آرہی تھی مری کا آسمان ابراؤد تھا، اور ٹھنڈی بلکہ پکپی طاری کرنے والی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ چونکہ ہم ابھی لاہور کی سخت گرمی سے نجات حاصل کر کے اس بہشت میں داخل ہوئے تھے۔ اس لئے سردی کا خیال کئے بغیر بڑے مزے سے صرف بنیان میں ہی ادھر ادھر چکر لگا رہے تھے۔ میں نے آئینہ بالکونی کے بانس میں اڑایا، اور صابن لگا کر شیو بنانے لگا۔ کبخت صوفی نے ہمیں شیو کے لئے انتہائی بخ پانی بھجوا یا تھا۔ جس نے بالوں کو نرم کرنے کی بجائے انھیں مزید سخت بنا دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب ہم سب شیو سے فارغ ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے گالوں کی کھال اتر گئی ہے مگر بال ایک بھی نہیں اترا چرکٹے ماؤ کا تو برا حال ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ سے چہرہ پھیل گیا تھا۔ جہاں اُس نے پاؤ ڈر تھوپ رکھا تھا۔ سوٹ کیسوں میں سے ہم نے بڑی محنت سے استری کر کے تنہ کی ہوئی پتلونیں فیضیں، مغلدار سوئیٹر نکالے۔ ان میں سے فنیائل کی گولیوں کی بو کے جھکے اٹھ رہے تھے۔ انہیں مہنگوں میں ڈال کر دروازوں کی پٹھنیوں سے لٹکایا (کیونکہ دیواریں شور زدہ تھیں اور کپڑوں کی الماری کا ہوٹل سلورکنگ میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا) منانے کے لئے باری باری

نیچے ایک ایسے غسل خانے میں جانا پڑا جس کے فرش پر پھپھلی کی جڑ سے کھڑا ہوا کسی مرد مجاہد کا ہی کام تھا۔ اس پرستم یہ کہ اس کا بیڑ چٹختی کے دروازہ بار بار ٹھٹک سے کھل جاتا۔ معلوم ہوتا کہ میرا تسلد ہاتھ میں لئے پانی لینے آیا ہے۔ میرا اس قسم کے مناظر کا عادی تھا۔ وہ ہماری طرف آنکھ اٹھائے بغیر بڑے اطمینان سے تل کے نیچے تسلد رکھ کر اسے بھرتا اور باہر نکل جاتا۔ نہانے کے بعد سردی میں سب کے دانت بجنے لگے۔ فوراً گرم چائے منگوا کر پی گئی۔ جس میو، سے ایک ایسی لکڑی کی بو آرہی تھی، جو وارنش کے پیسے میں پڑی پڑی سڑکتی ہو۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر کپڑے پہنے گئے۔ پتھونوں کی اور ٹائیوں کا تبادلہ ہوا۔ میری مائی اچی کو پسند آگئی۔ اچی کا پھولدار سوئٹر خواجہ نے پہن لیا اور اپنی چمڑے کی جیکٹ اٹے دی۔ ماؤ نے اپنا ہزار سالہ پرانا شادی والا گبر ڈین کا سوٹ زیب تن کیا جس کی میل استری کی وجہ سے جگہ جگہ چمک رہی تھی۔ اس نے ایک سوئٹر بنیان کے اندر اور دوسرا قمیض کے اوپر پہنا، اور خاکی ادنی مغلہ گردن کے گرد ڈیپٹ لیا۔ جب ہم پھیلے بنے، پچھپ کرتے شہزادوں کی طرح سری کی مال روڈ پر نکلے تو کسی کو دیکھ کر خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ ہم ہوٹل سلورکنگ کے کباڑ خانے میں رہتے ہیں، اور ہم نے اپنے بستر سیلے فرش پر لگا رکھے ہیں۔

مال پر بڑی چیل پیل تھی۔ سیزن اپنے جو بن پر تھا۔ عورتیں ریشمی ساریوں، غراروں اور شلو اور قمیضوں میں ملبوس، بھپور میک اپ کئے ادھر ادھر چل پھر رہی تھیں کارلج کی بال کٹی شوخ و شنگ لڑکیاں ٹوٹیوں کی صورت میں ہنستی ہنستی لگاتیں خوشبو اڑاتی سنہری بدلیوں کی طرح گزر رہی تھیں، پھیکے پٹمرہ چہروں والے بیو باری لکڑیوں کی مدد سے ہانپ ہانپ کر مال روڈ کی چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ ہونٹوں میں بڑی گامگمی تھی۔ شام ہونے کو تھی۔ موسم بے حد خوشگوار تھا آسمان بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ سرمئی بادلوں کا کوئی زندہ دل آوارہ کھڑا ادھر ادھر چڑھ کے درختوں میں سے ہوتا ہوا جیکے سے مال پر اتر آتا اور ریاں وہاں خوبصورت آنکھوں والی خوشبودار لڑکیوں کے گال سہلاتا، وادی کی طرف نکل جاتا۔ مال روڈ پر کچھ دیر

لئے دھند چھا جاتی، اور کانوں میں جھولتے اجڑے آویزے نظروں کے سامنے ادھل ہو جاتے۔ پھر جب عاشق مزاج بادل کا شہزادہ خوشبوؤں اور خوبصورت بخار سے مٹے مال پر سے پھسل کر وادی میں اتر جاتا تو لوگوں کے چہروں اور کپڑوں کی ہلکی سی تہ جی ہوتی عورتیں جلدی جلدی دکانوں میں داخل ہو کر چہروں پر پف نیس۔ لمبی لمبی گھٹنوں پر تنگ، ہوتی قمیضوں والی کشیدہ قامت لڑکیاں ہنس س کر ایک دوسری سے باتیں کرنے لگتیں، یوں معلوم ہوتا گویا گہرے دیزلر کے ٹپ جانے سے ایک دم سورج نکل آیا ہو، اور اس کی سنہری کرنوں سے وادی روشن ہو گئی ہو۔

”مال پر نظارہ بازی کیلئے تین ہوٹل سے بڑھ کر کوئی اچھی جگہ نہیں ہے دوستو! یہ خیال زندہ دل ماؤ کا تھا۔ چنانچہ ہماری ٹولی نے سمیز کے جہازی ہوٹل پہنچ کر ایک بڑا ساموزوں کو نہ قبضے میں کر لیا ہوٹل میں اس وقت بڑی رونق تھی۔ کوئی ٹیبل خالی نہ تھی۔ کونے میں بیٹھے ہی ماؤ کی آنکھوں نے بڑی جا بکدستی سے دم پھر کر ماحول کا پورا جائزہ لیا، اور آخر ایک جگہ مرکوز ہو گئیں۔ یہاں تیس بیٹیں اس کی ایک ہٹی کٹی لال گلاب چھوٹے پھولے گالوں والی عورت بیٹھی ایک گنچے جی سے باتیں کر رہی تھی۔ عورت کے بال برجی بارودیت کے انداز میں ماتھے پڑے ہوئے تھے۔ جسم کے ساتھ بالکل فٹ ریشمی قمیض اس کے جسم کے ام بھدے اور بھاری بھر کم خطوط نمایاں کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا، کہ ہمارا دست ماؤ اس کی طرف ٹپکنی لگائے دیکھ رہا ہے..... چہرے کا رنگ فق ہے۔ اور آنکھوں میں بار بار پانی آ جاتا ہے۔ خواجہ دیگر نے اپنی انگلیاں ماؤ کی ہلی میں گھس دیں۔

”کھینے! کیوں اپنا خانہ خراب کر رہا ہے ر“

ماؤ کھی کھی کر کے گردن ایک طرف ہٹا کر ہنسنے لگا۔ ہم گرم گرم کافی پی رہے تھے، اور باہر ہلکی ہلکی بوند باندی شروع ہو گئی تھی۔ ماں پر اڑتی پھرتی تیلیوں کے قدم

نیز ہو گئے۔ اب لڑکیوں کی جوڑیاں آرہی تھیں۔ انہوں نے نیلی پیلی، زرد اور
 پتک رنگ کی نائٹوں کی برساتیاں پہن رکھی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے
 بزم بھولوں کے گلدستے سیر کیلئے مال روڈ پر نکل آئے ہوں۔

”یارو! اس حسینہ گلغزار کا آپتہ معلوم کرنا چاہئے۔“

ماؤ نے بڑی تشویش سے سر ہلا کر کہا۔ خواجہ نیا سگریٹ سلکا کر بولا۔

”ارے گلغام کے پُتر! کبھی تو نے آئینے میں اپنی شکل بھی دیکھی ہے کیا؟“

”شکل دنیا میں کوئی شے نہیں خواجہ۔ میں نے کہا آسکر وائلڈ کا وہ جملہ تو تم

سنا ہی ہو گا کہ عورت کالوں کے بھروسے محبت کرتی ہے، اب ایک قول میرا

سن لو۔ حسین سے حسین عورت ایک گونگے کے قدموں پر جھک سکتی ہے بشرطیکہ

دولت مند ہو تم اسے ایک فرسودہ خیال کو گے، لیکن میں کہتا ہوں یہ ایک

بڑی حقیقت ہے۔ عورت صرف زبان اور دولت سے عشق کرتی ہے۔“

اجی نے دیا سلائی کان میں گھماتے ہوئے کہا:-

”اس عورت کے متعلق کیا خیال ہے جناب کا؟“

ہم سب نے نیچے دیکھا۔ مال پر ایک موٹی بھڑی بے حد بد شکل عورت

بے اندازہ میک اپ تھوپے قدم قدم پر شرما تی بل کھاتی چلی جا رہی تھی۔

وہ تھمہ لگا کر مہنسا۔ اس کے قہقہے کی آواز ہمارے سوا ہوٹل میں اور کسی

نہ سنی۔ ماؤ بڑے موڈ میں آ رہا تھا، اور بڑی گرم گرم متلاشی نگاہوں سے برجی بلار

کے بالوں ایسی موٹی عورت کو دیکھ رہا تھا۔ جب تیسری بار ماؤ نے کافی کا آرڈر

تو خواجہ نے کافی کے بجٹ کے پیسے نکال کر میز پر رکھ دیئے۔ ماؤ دانت نا

کر بولا:-

”فکر نہ کرو۔ اس آفتِ روزگار کے نام پر ایک کافی میری

سے۔“

رات کو جب ہم مال کی سیر کے بعد قسم قسم کی خوبصورت لڑکیوں کے قصو

سے۔“

رات کو جب ہم مال کی سیر کے بعد قسم قسم کی خوبصورت لڑکیوں کے قصو

سے۔“

سے۔“

”منہم کرو خواجہ — خدا کی قسم کبھی ہماری دوستی کو یاد کرو گے۔“
سگریٹ پلاؤ۔“

خواجہ کا پہلا سگریٹ صوفی نے سلگا کر ایک لمبا کش لیا، اور کھانسنے کا
باہر نکل گیا۔ رات کو کمرہ بج ہو گیا۔ سیلی دیواریں ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرنے
بند کھڑکیوں کے ٹوٹے ہوئے شیشوں میں سے سرد ہوا کے فرائے چلے آ رہے
اس پر طرہ یہ کہ دو ایک جگہوں سے چھت بھی ٹپکنے لگی بارش تھی کہ تھمنے کا نام
لیتی تھی۔ ہم سب اپنے اپنے لحافوں میں گھس گئے۔ ماؤ کو پلنگ پر لیٹتے ہی وہ
ہو گیا کہ اس نے پلنگ کا انتخاب کر کے بہت بھاری غلطی کی ہے۔ کیونکہ پلنگ
کھٹملوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے بار بار پہلو بدلتے سے پلنگ بڑے ڈراؤنے
میں چرچرانے لگا۔ آخر ماؤ اپنے لحاف سے باہر کوڈ آیا۔ اس نے بتی جلائی۔ اچ
آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”آخر تمہیں تکلیف کیا ہے؟“

”کھٹمل۔“ ماؤ نے چھاتی پر رینگتے ہوئے ایک کھٹمل پر زور سے ہاتھ مارا
ہم سب ہنس پڑے۔

”اور سوؤ بیٹا پلنگ پر۔“

ماؤ نے پٹرے پین کر کمرے سے منہ سر لپیٹا اور میرے بستر میں آکر بیٹھ گیا
بارش نے مری کی وادی اور اونچی نیچی مڑکوں کے خوب صورت بنگلوں، کاجڑوں
غریب داڑوں کے جھونپڑوں کو دھند کی گہری چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔
ماؤ سردی میں ٹھٹھر رہا تھا، کہنے لگا۔

”یارو آگ جلائی جائے۔“

اس نے اٹھ کر ادھر ادھر دیکھا مگر وہاں کوئی شے جلانے والی نہ تھی۔ تاہم
نے دروازہ کھول کر بالکونی کے فرش کی دو تین کچی اکھاڑیں، اور انہیں آتش
جوڑ کر آگ سلگالی۔ کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔ ہر کوئی کھانستا ہوا ماؤ کو گالیاں دے

لگا۔ مگر جب سُرُخ سُرُخ گرم گرم آگ روشن ہو گئی تو سب آتش دان کے قریب
آکر بستر پر لحاف اوڑھ کر بیٹھ گئے۔ چائے کی کیتلی آگ پر رکھ دی گئی۔ تھوڑی
دیر بعد چائے کا دور چلنے لگا۔ ماؤ نے چٹخارہ بھر کر کہا۔

”جادو بھالو تنہا لگی میں ہے۔ سالا میاں ہوتا تو چائے کی جگہ مشروب احمریں
کا دور چل رہا ہوتا۔“

احمی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ خواجہ نے سگریٹ بنا کر احمی کو دیا۔ دوسرا خود سلگا کر بولا
”میں نے اُسے خط لکھ دیا ہے۔ امید ہے کل تک آجائے گا۔“
”بس پھر مزا آجائے گا۔“ ماؤ بولا۔

خواجہ اپنی باریک کمانی دار عینک کے شیشے منہ کی بھاپ دے کر صاف کرتے
ہوئے بولا۔

”پورا راجہ اندر ہے راجہ اندر۔“

ماؤ نے چائے کی میسرے پیالی غما غٹ چڑھا کر ڈکار مار کر کہا۔

”بس پھر کل اس کباڑ خانے میں راجہ اندر کا دربار لگے گا۔“

”اور آج؟“ احمی نے پہلی آنکھیں جھپکا کر پوچھا۔

ماؤ ہنس پڑا۔ آگ کی روشنی میں اس کی گنجی کھوپڑی چمک رہی تھی۔ ٹیڑھے

میرٹھے دانت نکالے وہ کوئی بھوت معلوم ہو رہا تھا۔

”وہ آج راجہ اندر کی داستان ہو گی۔ کمانی لکھنے والا اس داستان کو پراچین

بھارت کے ایسے دور سے شروع کرتا ہے۔ جب آکاش کی اپسرائیں دھرتی کے بایلوں

کے ساتھ شادیاں کیا کرتی تھیں۔ کہتے ہیں اسی زمانے میں.....“

اس کے بعد ماؤ نے اپنے مخصوص دل نشیں اور شیریں انداز میں تشبیہوں اور استعاروں

کے سنگار سے آراستہ پیراستہ ایک ایسی دل ربا داستان کا آغاز کیا جس نے ہم سبھوں کی

نیند اڑا دی۔

اس نے ایک سگار ماؤ کو دیا، اور بولا۔

”یہ اسی کمپنی کا سگار ہے جو چرچل کے لئے سگار تیار کرتی ہے۔ ہمارا جو چوڑھو
کے پاس پہلی بار میں نے یہ سگار لیا تھا۔ اس کے بعد تو میں نے اس کے علاوہ
بھی کچھ لیا ہی نہیں۔ ڈائریکٹ انگیلنڈ سے منگواتا ہوں۔ ڈیوٹی وغیرہ نکال کر ایک پڑے
اسگار پڑتا ہے۔“

ماؤ کو بے اختیار کھانسی آگئی۔

”بڑا کڑوا ہے یہ!“

”اجی مدراس میں اس سے بھی کڑوے پئے ہیں میں نے۔“

اس کے بعد ایجنٹ کی ہم سے دوستی ہو گئی۔ وہ اکثر ہمارے پاس آنے لگا
لیکن ہمیشہ ہم پر اپنے کمرے سے ہی پی کر آتا اور سگار بھی صرف ایک ہی لے کر آتا جو
اس کے منہ میں سلگ رہا ہوتا۔ ایک روز لڑکیوں کی بات چل نکلی تو کہنے لگا۔

”والی بیجا پور میرا بڑا فاسٹ فرینڈ تھا۔ سارا محل میرے ڈسپوزل پر تھا۔ دربار
میں ایک لڑکی مجھ پر عاشق ہو گئی۔ دینا کی حسین ترین لڑکی تھی۔ میرے ساتھ لاکھوں کے
موتی لے کر فرار ہونے پر تیار ہو گئی۔ لیکن بھائی میں نے ارادہ بدل دیا۔ بڑی کمپنی
کیشنر پیدا ہو جانے کا ڈر تھا۔“

صوفی نے ہوٹل کے احاطے میں سیب کا پودا لگایا۔ وہ کمبخت بڑا ہی ہونے میں
نہیں آتا تھا۔ ایجنٹ نے اس کی ٹہنی پر بنیض دیکھنے کے انداز میں ہاتھ رکھ کر کہا۔

”غزری سیب نہیں ہے۔ بیوندی ہے، اور پھر مرچکا ہے۔ ہاں یاد آیا۔ میرے
ایسٹ آباد والے گھر میں غزری سیب کا درخت ہے۔ شہنشاہ جاپان کے خاص محل کا
تخت ہے مجھے میرے ایک دوست افسر زراعت نے دیا تھا۔ غزری سیب کے علاوہ
میں نے کبھی کوئی اور سیب نہیں کھایا۔“

ایک دفعہ ایجنٹ صاحب بیمار پڑ گئے۔ میں مزاج پُرسی کو گیا بستر میں دھنسنے
تھے۔ گرم پانی کی تین بوتلیں لحاف کے اندر دو بوج رکھی تھیں۔ میں نے پوچھا۔

۳

ہمارے ساتھ ہی بازو والے کمرے میں ایک وقیانوسی انشورنس کمپنی کے ایجنٹ
کی رہائش تھی۔ تنگ پیشانی، عورتوں ایسے بال پتھر ایسا سر دبے جان چہرہ، چھپکے
داغ، گدھ ایسی نوکیلی ناک۔ چالیس پتالیس کی عمر۔ ہر وقت سجا بنا رہتا۔ سارا
عمر بھارت کے بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کی مصاحبت میں گزری تھی۔ لیکن
جس کی وجہ سے گفتگو کا انداز خوشامدی اور پھر بازی کی حد تک مبالغہ آمیز ہو گیا تھا۔
صبح صبح سچ بن کر چمڑے کا تھیلہ ہاتھ میں لے اس کا ٹھکڑا گلام سے باہر نکلتا اور دوپہر کے
کھانے پر واپس آ جاتا، نیز طبیعت میں مانگے کا امیرانہ ٹھاٹھ جڑ پکڑ چکا تھا۔ چنانچہ خواہ مخواہ
ہوٹل کے بیروں پر برستے رہتا، اور صوفی کے سامنے بڑے بڑے ہوٹلوں کے حوالے میرے
دیتے رہتا اس کا معمول ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی شام کو اسے ملنے ایک عیسائی عورت
آیا کرتی تھی۔ وہ لب بھپ کرتی لنگا سنبھالتی سلورکنگ ہوٹل کی کٹری کی چڑیوں کو
سیڑھیاں ملے کر کے ایجنٹ کے کمرے میں داخل ہو جاتی جو اس کے انتظار میں
نیم وا ہوتا۔ دروازہ اس کے اندر داخل ہوتے ہی بند ہو جاتا۔ ہم نے ماؤ کے
مشورے پر عمل کرتے ہوئے۔ دیوار میں ایک جگہ جہاں کٹری کے تختے لگے
سوراج کر رکھا تھا۔ ادھر وہ محبت کی ماری ایجنٹ کے کمرے میں گھستی ادھر
چار دیں دریاخ کی طرف اٹھ دوڑتے۔ ایک روز سگار جلانے کے لئے ماچس کا
تکاش میسا پر ایجنٹ ہمارے کباڑ خانے میں نکل آیا۔ ہماری اس سے دوستی ہو گئی۔

”تکلیف تو بہت ہوتی ہوگی۔“
سر جھٹک کر بولا۔

”مجھے کبھی تکلیف نہیں ہوئی۔ ایک بار ہوئی تھی تو مٹری کے پندرہ ڈاکٹر
لئے تھے، اور ان میں سے کوئی بھی کرنل کے رینک سے نیچے نہ تھا۔ ڈاکٹروں کا
بورڈ بیٹھ گیا تھا۔

۴

ویسے یہ آدمی بڑا ہوشیار تھا۔ اس میں اصل بات کو بڑی چالاکی سے ٹال
کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ ماؤ نے کئی بار اس سے پوچھنا چاہا کہ وہ عیسائی کس
کون ہے جو اُسے کبھی کبھی شام کو ملنے آیا کرتی ہے؟ لیکن ایجنٹ ہر بار بات کا
دوسری طرف پھیر دیتا، اور اتنی خوب صورتی سے کہ ہم سب اس کا منہ دیکھتے رہ جا
ہم سب نے دل میں ٹھان رکھی تھی کہ اس پُرکار ایجنٹ کے پیچھے جادو بھالو کو
گے وہ اسے چاروں شانے چیت گرا دے گا۔

اگلے روز شام کو سمیٹر ہوٹل کا پھر پروگرام بنا۔
چار بجے سے ہی ہمارے کباڑ جانے میں ہر آدمی تولیہ لئے ادھر ادھر منڈلاتا،
کیڑوں کو الٹا پلٹا، دن کے دن ادھار مانگی ہوئی پتلونوں، ٹائیوں اور قمیضوں کو استری
کرتا اور گر گر کر شیونانا نظر آرہا تھا۔ چھ بجے بنے ٹھننے بانگوں کا قافلہ سمیٹر کی گیلری
میں آکر بیٹھ گیا۔ کافی منگوا کر ہم نے نظر بازی شروع کر دی۔ مال پر رنگ برنگ ساڑھیوں
غزاردوں اور شلواروں کی ٹولیوں کی ٹولیاں گزر رہی تھیں۔ کوئی عورت ہماری نگاہوں
سے پکڑ نہ گزرتی تھی۔ ہوٹل میں بھی اچھی خاصی عورتیں بیٹھی کافی پی رہی تھیں۔ خواجہ کافی کی
پیالی سامنے رکھے، ہاتھ سے بنایا ہوا سگریٹ منہ میں لئے بیٹھا تھا، اور باری باری ہر
عورت کو گھورتے ہوئے انگلیاں چٹخا رہا تھا ماؤ۔ سنسنی سوئٹر پر جادوے بھالو کی سرخ
ٹائی لگائے چھیلا بنا بیٹھا تھا اور بات بات پر ہنس رہا تھا۔ اچھی سر درد کا بہانہ بنا کر
ہوٹل میں ہی رہ گیا تھا اور ہمارا خیال اب یقین میں بدل گیا تھا۔ کہ وہ ہوٹل کے پھوپھوڑے
ایک لونڈیا سے عشق لڑا رہا ہے۔ پیلے رنگ کی بی بی دہلی سی لڑکی جس کے گال پر سبز خال
کا نشان تھا بڑی تیزاد چمکیلی تھی سارا دن اپنے لکڑی کے پرانے چوبارہ کی کھڑکی میں
کھڑی ہم سے آنکھیں لڑا کرتی۔ اچھی اس پر جی جان سے فدا ہو گیا تھا، اور اس نے
لونڈیا سے باقاعدہ اشارہ بازی بھی شروع کر دی تھی۔ لونڈیا بھی ایک ہی آفت کی پڑیا
تھی۔ کبھی بال کو مکر جو گنوں ایسا ہر وہ پھر لیتی، اور کھڑکی کے پیٹ سے گلی آئیں بھرا

جادو بھالو پانچویں روز نتھیا لگی سے مری آیا۔ بھالوؤں ایسا ڈیل ڈول،
کے نیچے سیاہ مٹا، تنی ہوئی بھنویں۔ ناٹے قد کا چوڑا چکلا ہمارا پانچواں یار جادو
رنگ کی فوجی برانڈی میں ملبوس ہوٹل میں داخل ہوتے ہی صوفی سے بغلیں ہو گیا
بھر پور شکنجے میں لے کر اس نے صوفی کی ہڈیاں کرکڑا دیں۔

جادوے نے بھی پروگرام کے مطابق اپنا بستر ہمارے ہی کمرے میں یاکنے
لیا۔ اس نے اعلان کر دیا:-

”مہیتوا! اس مکھی چوٹس صوفی کے ہوٹل کی انیٹ سے اینٹ بجا دو۔
سب کچھ کھاپی کر اسے خاک سیاہ کر دو۔“

نرتی۔ کبھی آئینہ سامنے رکھ کر گالوں پر سُرخ تھوپنے لگتی۔ پھر اچی کو دیکھ کر شرمناک جاتی اور شوخی سے مسکرا کر پرے ہٹ جاتی اور کبھی دامن اٹھا کر چہرے کو ہوا کرنے لگتی۔ اچی کو اس نے پاگل بنا رکھا تھا۔ وہ رات کو اٹھ اٹھ کر بالکونی میں جاتا اور کھڑکی کی طرف منہ کر کے پہلے ٹھنڈی آہیں بھرتا، اور پھر اپنی نظر نہ آنے والی محبوبہ کو گالیاں دینی شروع کر دیتا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس عشق کا بھید ہماری منڈلی میں سب پر کھل گیا۔ اچی نے اقرار نہ کیا۔ صوفی نے اسے میاں تک کہہ دیا۔

”بیٹا عشق میں آہیں کیوں بھرتا ہے۔ اس سے عشق کیا ہے تو کم از کم اپنے کپڑے ہی مفت دھلوا لیا کرو اگر تو حاجی بھرے تو خدا کی قسم آج رات وہ تیرے پیلو میں لیکن اچی نے سوائے گالیوں کے اور کوئی جواب نہ دیا۔

سیمنز میں بیٹھ ایک گھنٹہ گزر گیا تھا باؤ کافی کا تیسرا پیالہ چڑھا رہا تھا۔ درہ آج کا بل جاوے نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ اس لئے ہم سبھوں کے دل شیر ہوئے تھے اور کافی پر خوب ہاتھ صاف کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک کیشہ قامت تیکھ نفش کی لڑکی جسٹ فیض میں ملبوس کانوں میں گولڈن رنگ اور ماتھے پر پوٹل کٹ بال ڈالے ہوٹل میں داخل ہوئی اور ایک میز پر اکیلی بیٹھ گئی۔ ہماری منڈلی میں ہر اک چپ ہو گیا۔ سب نے اپنی آنکھوں کے کیمرے اس لڑکی کی طرف فٹ کر لئے کی چھولی ہوئی ناک پر باریک کمانی کی عینک تھر تھرا رہی تھی اور اس نے شہادت انگلی کو زور سے چٹھایا۔ ماؤ کے ہونٹ لٹک گئے اور آنکھیں اندر کو سکڑ گئیں۔ جاوا گردن کو جھٹکا دے کر خرخرایا۔ کیشہ قامت حسینہ اپنے دھیان میں بیٹھی کافی پی رہی اس کا بسنتی پرس میز پر سامنے رکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں بھنوں تیلے نسواری رنگ کی وردش آنکھیں بڑی گہری محویت سے ماحول کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ماؤ نے پر بکرے کی طرح زبان پھرتے ہوئے اُسے لقب عطا کر دیا۔

”اڈرے ہپیرن!“

ایچانک ماؤ کا رنگ بدل گیا۔ سر کے مختصر بال کھڑے ہو گئے اور اس نے

قراری سے جو سانس یا تو ناک میں سیٹی سی بج اٹھی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ اس روز والی ہٹی کسی عورت برجی باردت کی طرح بال بنائے اپنے بادامی رنگ کے ٹھنکے کتے کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہو رہی ہے۔ ماؤ نے جاوے بھالو کو آہستہ سے کہنی ماری۔

”یہی عورت ہے جاوے۔ اسی نے مجھ غریب کو قتل کیا ہے۔“
موٹی عورت کاؤنٹر پر کھڑی ایک پیسٹری بندھو رہی تھی۔ ٹھنکے بادامی کتا بار بار اس کی ریشمی شلوار کو منہ مار رہا تھا۔ اور وہ ہر بار اس کی زنجیر کھینچ کر اُسے پیار سے جھڑک رہی تھی۔

”ڈونٹ بی سٹی پو پی؟“

خواجہ نے جھنگل چٹھاتے ہوئے کہا۔

”تمہیں بلا رہی ہے ماؤ۔“

اتنے میں اس نے چھوٹا سا پارسل تھام کر بل ادا کیا۔ اور کتے کی زنجیر سنبھالتی ہوٹل کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ ماؤ کے جسم میں ہیجان سا ہوا ہو گیا۔ اُسے اپنے سارے بدن پر چیونٹیاں رنگتی محسوس ہوئیں۔ اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر ایک فلک شگاف سرد آہ بھری اور اپنی جگہ سے بے اختیار اٹھتے ہوئے بولا۔

”دوستو! اب تاب انتظار نہیں۔“

اتنا کہہ کر وہ اپنی حوٹی پھیل چھیل..... مجربہ کے پیچھے ہی ہوٹل کی سیڑھیاں اتر گیا کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد جاوے بھالو نے ہوٹل واپس چلنے کا قصد کیا۔ اس کے مشرور کا وقت ہو گیا تھا۔ اب کے خواجہ نے اٹھنے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کے سامنے پوٹل کٹ بالوں والی کیشہ قامت اڈرے ہپیرن بیٹھی کافی کے بعد پرس میں سے ایک کتاب نکال کر مطالعے میں مگھ تھی۔ جاوا بھالو بڑا سٹپٹا۔

”تم سب دل پھینک عاشق ہو کمینو! ایک دن تم اپنے ساتھ مجھ شریف کو بھی تھانے پہنچاؤ گے۔“

اس نے بل ادا کیا اور ہم دونوں ہوٹل سلورکنگ والے اپنے کباڑ خانے میں

واپس آگئے۔ یہاں آکر ایک دوسرا عاشقانہ منظر دیکھا۔ اجمی پلنگ کی اوٹ میں فرشی اندھیرے میں اپنی محبوبہ کے مکان کی طرف ہاتھ سے بو سے اڑتا۔ میں اور جاوے بستر پر اپنی دھو بن محبوبہ کے پاس بیٹھا اُسے ماؤ کے سوٹ کیس میں سے نکالے ہوئے بل کر بڑی مشکل سے اُسے بستر پر لٹا دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اجمی زور زور سے خراٹے بکٹ کھلا رہا تھا۔

جاو ابھالو غصے میں آگیا۔
 ”میں یہ کبھی نہیں دیکھ سکتا کہ تم ایک غریب آدمی کی عزت خراب کرو۔ ایک شرٹ پہننے لگے۔“

زادی کو خراب کرنا کہاں کی سردانگی ہے؟ میں یہ ناک یہاں نہیں چلنے دوں گا۔“
 شریف زادی گول گول دیدے کھولے حیرت سے جاوے بھالو کی نرالی منطق دیکھ کر سوچ کر سو رہا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ مرد اتنا کمینہ سن رہی تھی۔ اجمی نے غراتے ہوئے کہا۔
 ”تم کون ہوتے ہو دخل دینے والے؟ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔“ بہر کنواری لڑکی اپنے خاوند کی امانت ہوتی ہے اس میں خیانت کرنے والے کی بھالو چیخا۔
 ”ردن قلم کر سکتا ہوں۔“

بکواس بند کرو۔ ہم میں سے کوئی محبت نہیں کر سکتا، ہم صرف بد معاشی کر سکتے جاو ابراہنڈی میں بھنس کر بیٹھا ہوا تھا۔ کافی نے بہت جلد ہمارے خون کو گرم کر ہیں۔ ہمارے پاؤں گناہ کی دلدل میں دھنس گئے ہیں۔ نکل جا چڑیل یہاں سے... اگر اُس نے براہنڈی اتار کر سرہانے رکھ لی۔ اس کی آنکھوں کی رنگت گلابی ہو رہی تھی۔ پھر قدم رکھا، تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ جوانی کا اتنا ہی زور ہے تو شادی کر لے۔“
 اجمی اٹھ کر کھڑا ہو گیا نشتے میں جھول رہا تھا۔ اس نے جلدی سے پلنگ کا سہارا لیا۔
 ”میں اس سے شادی کر رہا ہوں جاوے۔“

”تم دوسرے ہی دن اسے طلاق دے دو گے۔ اس کے ساتھ کوئی دھوبی ہی رہیں تھا۔ کہہ کے کی طرح خراٹے لے رہا ہے۔ جی چاہتا ہے سر پر بوتل دے ماروں۔“
 ”بار مجھے ایک عورت سے محبت ہو گئی۔ سالی نے کوئی ایسا منتر پھونکا کہ میں اس جھپے باؤلا ہو گیا۔ میں نے سب برائیوں سے توبہ تبرا کر لی اور اس سے شادی کرنے رہیں تھا۔ کہہ کر افرامیری گھڑی اور ساری نقدی لے کر فرار ہو گئی۔ اب تو محبت کے سے رُوح کا نپ جاتی ہے اور میری ایک بات تم بھی یاد رکھنا شریف عورت پر لگایہ سارا ماجرا سن رہا تھا۔ وہ جلدی سے پرے ہٹ گیا۔ لونڈیا گیلری کے چڑچڑاتے نظر نہ ڈالنا۔ اب میری طرف ہی دیکھو... عورت کے نام پر میری جان جاتی ہے۔ تختوں پر سنبھل سنبھل کر چلتی جب میرٹھیاں اترنے لگی تو صوفی نے اسے دبوچ لیا۔ خدا کی قسم شریف عورت سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا۔ بس یہی جی چاہتا ہے کہ اس قدموں سے پالتو کتے کی طرح پیٹ جاؤں۔“

”میرا حساب تو صاف کرتی جا۔“
 اجمی کو واقعی اس دھو بن کی لونڈیا سے عشق ہو گیا تھا۔ رات کو وہ زار و قطار رونے لگا۔ لونڈیا کا نام لے لے کر وہ سیدہ کو بی کرتا۔ اٹھ اٹھ کر بالکونی کی طرف جاتا، اور رات بالوں پر پانی کے قطرے جم رہے تھے۔ معلوم ہوا باہر لونڈا باندی ہو رہی ہے۔

”دیار سے اتم پہلے کہاں تھے؟“

میں نے کہا۔

”تمہارے قدموں میں۔“

”غضب خدا کا پہلی نظر کا عشق بھی کیا ہوتا ہے۔“

جادو نے ماؤ کی گنجی چندیا پر دھول جاکر کہا۔

”اس نے اپنے دلہپ کمار کی گنجی کھوپڑی نہیں دیکھی کیا؟“

”تم مجھے اتنا بے وقوف سمجھتے ہو؟ میں نے سر منظر سے ڈھانپ رکھا تھا۔“

ماؤ نے مشتعل ہو کر دانت بچھنے لگے اور منہ اور ناک سے عجیب و غریب قسم کی

وازیں نکالنے لگا۔

”گھراؤ نہیں دوزخ کے دروازے پر ہم تمہارا انتظار کریں گے۔“

آخر ماؤ سچی بات بتانے پر مجبور ہو گیا۔ کہنے لگا۔

”میں محبت کرنے کے لئے پتھر کا کیچو چاہے خواجہ ایماں سب سنگدل ہیں۔“

سارا وقت جادا بھالو خواجہ کی باتیں سنتے ہوئے دانتوں سے انگلیوں کیار کا ہاتھ بڑھاؤ لوگ کتے چھوڑ دیتے ہیں۔ کتوں سے پیار کروستم گر تھانے بھجوا دیتے

کرتار ہا۔ جب خواجہ نے اپنی دام کمانی ختم کی تو جادوے نے گلاس حلق میں انڈس۔ میں تو جوجیوں کا بھیس بدل کر کاغان کی چوٹیوں پر جا رہا ہوں۔ دوستو! میرے گھر

بزرگ کر دینا..... میرا سر گنجہ ہو گیا ہے میں پہلے سے زیادہ بد صورت ہو گیا ہوں۔ چار

”میں تیری ایک ایک رگ سے واقف ہوں خواجہ! تو جھوٹ بول رہا ہے پچھلے پیدا ہو چکے ہیں۔ پانچواں بھی ہو جائے گا۔ ہر صبح منہ پر پٹکار پڑی ہوتی ہے۔ دینا

ایک گھنٹہ بعد ہمارے یار ماؤ تشریف لائے تو پانی میں نچڑے ٹھٹھڑے میں مشروب ہی ایک سہارا ہے۔ بیوی کو بچوں سے فرصت نہیں ملتی ہے وہ میری

معلوم ہوا کہ باہر باقاعدہ پانی برسنے لگا ہے۔ آپ نے جلدی جلدی کپڑے اتاریں۔ میرے بچوں کی بیوی ہے، اور میں در در مارا پھرتا ہوں، اور وہ سالی موٹی عورت

دھوتی میناں پہنی۔ کبسل اوڑھا اور میرے پاس پلنگ پر آکر اکڑوں بیٹھ گئے..... اس نے اپنا کتا میرے پیچھے چھوڑ دیا۔ خواجہ! بیوی بڑی پیاری شے ہوتی ہے

اپنی محبت کی داستان سنانی شروع کر دی۔

”دوستو! مجھ سے کوئی سی قسم لے لو۔ اس قتالہ جہاں نے کل رات مجھ لعنت! بیوی کے تین خط آئے ہیں۔ ایک کا بھی جواب نہیں لکھا کیا لکھوں؟ مری

پر اپنے گھر بلایا ہے۔ جادوے! اپنا نیلا سوٹ کل تیار رکھنا مائی خواجہ کی بڑی بیٹی پناہ لینے آیا تھا۔ یہاں بھی سکون نہیں مل سکا۔ کہاں جاؤں؟ کدھر کو جاؤں؟.....؟“

گی۔ الٹی توبہ! ایسی عورت نہ دیکھی نہ سنی۔ ارے جادوے! وہ تو مجھ پر فدا ہو

آپ گھنٹہ بھر اپنی متوقع فحشہ آڈر سے پیدر بن کے سامنے ہٹل میں بیٹھے رہے۔

بیچھے بیچھے اس کے کالج تک گئے۔ دیزنگ کالج کے ارد گرد منڈلاتے رہے۔

کو بھی شہ ہو گیا تھا، کہ آپ اس پر ٹو ہو گئے ہیں۔ تفریح طبع کیلئے وہ بھی گھر کے راز

میں دو ایک بار مڑ کر انھیں دیکھتی رہی۔ کالج میں داخل ہونے کے بعد اس نے ایک

کھڑکی سے باہر دیکھا۔ خواجہ صاحب کو یقین ہو گیا کہ محبت ٹھن گئی ہے۔ جلدی سے

کا ایک پھول توڑ کر لڑکی کی طرف اچھال دیا۔ لڑکی نے غصے اور نفرت سے آپ کی ط

دیکھا۔ آپ مسکرا دیئے لڑکی نے پاؤں سے سینڈل نکال کر دکھائی اور ماتھے کے بالا

کر کھڑکی بند کر کے چلی گئی۔ لیکن میاں آکر انہوں نے جو بیان دیا وہ یہ تھا۔

”آپ لوگ چلے آئے تو میں اٹھ کر اس کی میز پر جا بیٹھا۔ میں نے اسے کافی

دی جو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کر لی۔ کافی دیزنگ موسم کی اور فلموں کی باتیں

پھر ہم وہاں سے اٹھے اور سینکڑل پوائنٹ کی جانب سیر کرنے نکل گئے

سارا وقت جادا بھالو خواجہ کی باتیں سنتے ہوئے دانتوں سے انگلیوں کیار کا ہاتھ بڑھاؤ لوگ کتے چھوڑ دیتے ہیں۔ کتوں سے پیار کروستم گر تھانے بھجوا دیتے

کرتار ہا۔ جب خواجہ نے اپنی دام کمانی ختم کی تو جادوے نے گلاس حلق میں انڈس۔ میں تو جوجیوں کا بھیس بدل کر کاغان کی چوٹیوں پر جا رہا ہوں۔ دوستو! میرے گھر

بزرگ کر دینا..... میرا سر گنجہ ہو گیا ہے میں پہلے سے زیادہ بد صورت ہو گیا ہوں۔ چار

”میں تیری ایک ایک رگ سے واقف ہوں خواجہ! تو جھوٹ بول رہا ہے پچھلے پیدا ہو چکے ہیں۔ پانچواں بھی ہو جائے گا۔ ہر صبح منہ پر پٹکار پڑی ہوتی ہے۔ دینا

ایک گھنٹہ بعد ہمارے یار ماؤ تشریف لائے تو پانی میں نچڑے ٹھٹھڑے میں مشروب ہی ایک سہارا ہے۔ بیوی کو بچوں سے فرصت نہیں ملتی ہے وہ میری

معلوم ہوا کہ باہر باقاعدہ پانی برسنے لگا ہے۔ آپ نے جلدی جلدی کپڑے اتاریں۔ میرے بچوں کی بیوی ہے، اور میں در در مارا پھرتا ہوں، اور وہ سالی موٹی عورت

دھوتی میناں پہنی۔ کبسل اوڑھا اور میرے پاس پلنگ پر آکر اکڑوں بیٹھ گئے..... اس نے اپنا کتا میرے پیچھے چھوڑ دیا۔ خواجہ! بیوی بڑی پیاری شے ہوتی ہے

اپنی محبت کی داستان سنانی شروع کر دی۔

”دوستو! مجھ سے کوئی سی قسم لے لو۔ اس قتالہ جہاں نے کل رات مجھ لعنت! بیوی کے تین خط آئے ہیں۔ ایک کا بھی جواب نہیں لکھا کیا لکھوں؟ مری

پر اپنے گھر بلایا ہے۔ جادوے! اپنا نیلا سوٹ کل تیار رکھنا مائی خواجہ کی بڑی بیٹی پناہ لینے آیا تھا۔ یہاں بھی سکون نہیں مل سکا۔ کہاں جاؤں؟ کدھر کو جاؤں؟.....؟“

گی۔ الٹی توبہ! ایسی عورت نہ دیکھی نہ سنی۔ ارے جادوے! وہ تو مجھ پر فدا ہو

کہنے لگی۔

آنکھوں کی تیلیاں پھیل گئی تھیں چہرے کی چھایاں زیادہ گہری ہو گئی تھیں۔ وہ پتنگ سے ایک سگریٹ لے کر جاوے نے سگایا بولا۔

اٹھ کر دھوئی بنیان میں کمرے میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح چکر کھانے لگا ہم سب نے اسے ہر بدکاری اپنے پیچھے ندامت کی ایک تیز دھار والی گیر چھوڑ جاتی ہے جو انسانی مل کر اسے بمشکل سنبھالا۔ ہمارے قدم بھی لڑکھڑا رہے تھے۔ اگر خواجہ وہاں نہ ہوتا شخصیت کو دو ٹوکڑوں میں کاٹ کر رکھ دیتی ہے، اور زنا سے بڑھ کر دنیا میں کوئی برائی شاید ہم سب نے مل ملا کر اپنا برا حال کر لیا ہوتا۔ ماؤ نے دیوار سے لگے آئینے میں اپنی ٹانگیں ایسی نہیں جس کا خمیازہ آدمی کو اتنی جلدی جھگٹنا پڑتا ہو۔ ہمیں اس عظیم کام دیکھی تو بیخ مار کر رونے لگا۔

”یہ کسی ریچھ کا چہرہ ہے۔ یا اللہ! مجھے معاف کر دینا۔“

اجی بے سدھ ہو کر سو رہا تھا۔ شاید خواب میں لوندیا سے عشق لڑا رہا تھا۔ ماؤ کی خوراک میا کرنے کی خاطر برائی کرنی پڑتی ہے ہم اس عفریت کے ہاتھوں میں کھلوتا بن کر کھینے لگتے ہیں۔ جس طرح جھوٹے کالام بھی جھوٹا ہوتا ہے۔ اسی طرح عادی بدکار کا پر لوٹنے لگا۔

”میرے بچے بھی بڑے ہو کر مشروب پیئیں گے۔ میں ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔“ میری بدکاری میں ملوث ہو کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اچائی کے راستے سے ہٹا دیتا۔ بڑھاپا وقت سے پہلے مجھے آنکھیں دکھانے لگا ہے۔ خواجہ نے بڑی مشکل کے ساتھ اپنے ساتھ اپنے انسان کی عقل اور تدبیر سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ یہاں صرف خدا کی رحمت کو اجی کے پاس اس کے بستر پر ڈال دیا۔ کتنی ہی دیر تک وہ بستر پر سرسبز رہا اور اپنی بڑائی کا کام آتی ہے۔ میرا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ یوں لگتا ہے کہ میں شادی کے لائق ہی نہیں بچوں کو یاد کرتا رہا۔ پھر سو گیا۔ بے خبر ہو کر۔

اب کمرے میں صرف جاوا، امیں اور خواجہ تھے۔ خواجہ کو چومکھ معلوم ہو گیا تھا کہ اس کو گاجی کی وہ مستحق ہے۔ جب کبھی میں کسی شادی شدہ جوڑے کو بازار میں گزرتا یا باغ رات دیر تک دوڑ چلا گا۔ اس لئے وہ بڑے اطمینان سے کپڑے بدل کر اپنے بستر میں گئے۔ میں اپنے چھوٹے سے بچے کے ساتھ سیر کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے یہ منظر دنیا کے تمام نظاروں سے بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ہماری سوسائٹی اس سے زیادہ خوبصورت منظر آج تک پیش

وہ ایک بار پھر موج میں آ رہا تھا۔ اجی اور ماؤ گہری نیند سو رہے تھے۔ تھوڑا سا نہیں کر سکی۔ سوچتا ہوں میں بھی شادی شدہ ہوتا تو میرا بھی ایک پیارا سا بچہ ہوتا۔ میں بھی دن دیر بعد خواجہ کے خزانے بھی گونجنے لگے۔ جاوے نے بڑی پھرتی سے ٹھنڈا کباب منہ پر رکھا اور اُسے بے دلی سے جینانے لگا۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور بالکونی کے نیچے خیر مقدم کرتا۔ پھر سوچتا ہوں شاید مجھے کوئی حق نہیں کہ میں کسی شریف لڑکی سے شادی کر کے نکلی میں اس کے گرنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ جاوے نے براؤنڈ کی گھٹنوں پر ڈال رکھی تھی اور پتنگ کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے منہ آہستہ آہستہ کباب چبا رہا تھا۔ بند کمرے میں بھنے ہوئے گوشت اور تمباکو کی ملی جلی پھیلی ہوئی تھی۔ میری آنکھیں بھی جل رہی تھیں۔ میں نے نیا سگریٹ سگایا۔

جاوے نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ وہ انگاروں کی طرح سرخ ہو رہی تھی۔ سگریٹ پیتے ہوئے جاوے کے منہ میں تمباکو آگیا تھا وہ دیوار کی طرف منہ کر

کے تھوکنے لگا۔

دیکھو حرامی گھوڑے بچکر سو رہے ہیں۔ کیوں یار یہ نیند کی بلا ہے؟ سو جاؤ اور پھر جانے کیا کیا خواب آتے ہیں! اُف!..... سرچکر کھا گیا ہے۔“

ایک دم دروازہ دھڑاک سے کھلا اور گرم لمبے کوٹ اور مغر میں ٹھنڈا ٹھنڈا جھوٹے سر والا صوفی نمودار ہوا دونوں ہاتھ زور سے رگڑتے ہوئے اس نے نعرہ لگا ”آٹا! پارٹی پوری ہے۔“

جادو اتوں میں پھنسا ہوا گوشت نکالتے ہوئے لال لال آنکھوں سے اُسے گھورتا رہا اور کچھ نہ بولا۔

۵

غریب لڑکی کا عشق اچھی کے سر پر بھوت بن کر سوار ہو گیا تھا۔ وہ ہر رات لونڈیا سے لینے چھپ کر اس کے گھر جایا کرتا وہ سات کے بارہ بجے اپنی کھڑکی میں لیمپ جلا کر بچا جیتی یہ میدان صاف ہونے کا سگنل تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ گھر والے سب سو گئے ہیں۔ اب آجاؤ پیارے..... اچھی بالکونی میں کھڑا لیمپ کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ٹھہر رہا ہوتا۔ وہ کبیل اور ٹھہ کر جلدی سے باہر نکل جاتا اور پچھوڑے کی گلی پھاند کر لیدھا وارے میں پہنچ جاتا یہ ترکیب اسی عشق کی متوالی کے ذہن میں آئی تھی۔ وہ اپنے مکان کے عقب میں تنگاس پھولس سے بہری ہوئی کوٹھڑی میں اپنے محبوب کے انتظار میں چپم براہ ہوتی۔ گھنٹہ بھر وہ وہاں بیٹھے جی بھر باتیں کرتے اور پھر کل کے وعدے پر بدلا ہو جاتے۔ جاوا اسے اور خبردار کرتا۔

”بیٹے یاد رکھو، اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو اس کے تم خود ذمہ دار ہو گے۔ چھی کا دو دھیا دن آئے تو جاوا نام نہیں۔“

مگر اچھی منہ زور گھوڑے کی طرح عشق کی راہ میں سرپٹ دوڑے جا رہا تھا۔ وہ اس قسم کی باتیں سن کر سنس کے ٹال دیتا۔ آخر جوانی کی حماقتیں رنگ لے آئیں دھوبن لونڈیا کا ایک رات رنگ اڑا ہوا تھا۔ اس نے روتے ہوئے اچھی کو بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے بائے اللہ اب کیا کروں..... اچھی! اچھی!..... مجھ سے شادی کر لو۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

شادی کا نام سن کر اجمی کا حلق خشک ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ گدھوں پر گنبد پر اٹھیں ملتا اور پر اُڑا رہا تھا۔ اجمی نے اس کے سر پر سامان لادا اور لمبوں کے اڈے مندے کپڑوں کے گٹھر لادے دھوبی گھاٹ کو جا رہا ہے، اور ایک بکرہ وہ صوڑ پر آ گیا۔ پانچ بجے والی بس تیار کھڑی تھی۔ سامان بس کی پھت پر رکھو کر اس نے پنڈی پلا اس کے ساتھ ریں ریں کرتا چل رہا ہے۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا، ایک ٹکٹ کٹوایا۔ سرے کو ایک روپیہ دیا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر ”تم چپ کیوں ہو گئے اجمی؟ اگر تم نے شادی نہ کی تو میں تجھے کبھی معاف نہیں کر۔ بعد بس راولپنڈی کی طرف فرائے بھرتی اڑی جا رہی تھی۔ اجمی نے آنکھیں بند کر کے سر کھڑکی سے نگار کھا تھا۔ وہ اپنے آپ کو پھول سے بھی زیادہ ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

اجمی کے پاؤں تلے سے تو زمین نکل گئی۔ پہلی آنکھوں کا پانی خشک ہو گیا۔ ستر رہا تھا۔ کابھوت بھاپ بن کر اڑ گیا۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کر لیا کہ صبح منہ اندھیر ہے وہ بوریا بستر باندھ کوہ مری سے بھاگ جائے گا۔ اجمی نے گردن اڑا کر اپنی دھوم معشوقہ کو تسلی دی۔

”گھبراؤ نہیں، تمہارا ہاتھ پکڑا ہے تو چھوڑو گا نہیں۔ میں کل ہی تم سے شادی لوں گا۔ لیکن یہ شادی کہاں ہوگی، کیسے ہوگی؟“ بد نصیب دھوبن کا چہرہ ایک دم چمک اٹھا۔

”تم فکر نہ کرو۔ ہم یہاں سے بھاگ کر ڈونگا گلی اپنی خالہ کے پاس چلے جائیں گے۔ وہ میری راز دار ہے۔ ہم وہاں شادی رچالیں گے۔ باقی گھر کا معاملہ خالہ خود سنبھال لے گی۔ کل رات کو تم تیار رہنا۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔“

اجمی نے بڑے زور شور اور پورے اعتماد سے کل ڈونگا گلی جا کر شادی کر لینے کا دعویٰ کیا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے وہاں سے واپس چل پڑا۔ ہوٹل میں آکر وہ باہر جان پھر کی طرح اپنے ٹھنڈے بستر پر گر پڑا۔ اس نے گھڑی دیکھی اس وقت رات کے پورے دو بج رہے تھے، اور راولپنڈی کو پہلی بس پانچ بجے چھوٹتی تھی۔ کمرے میں سارے گری نیند میں سو رہے تھے۔ اجمی نے باقی رات بستر پر لیٹے لیٹے سگریٹ پھونکنے گزار دی۔ جب بالکونی کے باہر کھڑکی کے نشیوں میں صبح کی نیلی جھلکیاں نمودار ہوئیں تو وہ آہستہ سے اٹھا۔ بستر بغل میں دبا کر اچھی کیس ہاتھ میں لیا اور سب کو سوتا چھوڑ کر چپکے سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ سڑھیاں اترتے اُسے ہیرا مارا۔

”آج کل کچھ نہیں بھی تو بتاؤ۔“

چنانچہ ایک دن بعد سارا بھید کھل گیا۔ صوفی دوڑا دوڑا پریشانی کے عالم میں ہمارے کباڑ خانے میں آیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔

”نیچے سپاہی آیا ہے۔ یہ کیسے اجمی نے کیا نکل کھلا دیا۔ وہ مجھ سے اجمی کا ناپتا پوچھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ محلے کا چوہدری بھی ہے۔“

شادی کا نام سن کر اجمی کا حلق خشک ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ گدھوں پر گنبد پر اٹھیں ملتا اور پر اُڑا رہا تھا۔ اجمی نے اس کے سر پر سامان لادا اور لمبوں کے اڈے مندے کپڑوں کے گٹھر لادے دھوبی گھاٹ کو جا رہا ہے، اور ایک بکرہ وہ صوڑ پر آ گیا۔ پانچ بجے والی بس تیار کھڑی تھی۔ سامان بس کی پھت پر رکھو کر اس نے پنڈی پلا اس کے ساتھ ریں ریں کرتا چل رہا ہے۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا، ایک ٹکٹ کٹوایا۔ سرے کو ایک روپیہ دیا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر ”تم چپ کیوں ہو گئے اجمی؟ اگر تم نے شادی نہ کی تو میں تجھے کبھی معاف نہیں کر۔ بعد بس راولپنڈی کی طرف فرائے بھرتی اڑی جا رہی تھی۔ اجمی نے آنکھیں بند کر کے سر کھڑکی سے نگار کھا تھا۔ وہ اپنے آپ کو پھول سے بھی زیادہ ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

اجمی کے پاؤں تلے سے تو زمین نکل گئی۔ پہلی آنکھوں کا پانی خشک ہو گیا۔ ستر رہا تھا۔ کابھوت بھاپ بن کر اڑ گیا۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کر لیا کہ صبح منہ اندھیر ہے وہ بوریا بستر باندھ کوہ مری سے بھاگ جائے گا۔ اجمی نے گردن اڑا کر اپنی دھوم معشوقہ کو تسلی دی۔

”گھبراؤ نہیں، تمہارا ہاتھ پکڑا ہے تو چھوڑو گا نہیں۔ میں کل ہی تم سے شادی لوں گا۔ لیکن یہ شادی کہاں ہوگی، کیسے ہوگی؟“ بد نصیب دھوبن کا چہرہ ایک دم چمک اٹھا۔

”تم فکر نہ کرو۔ ہم یہاں سے بھاگ کر ڈونگا گلی اپنی خالہ کے پاس چلے جائیں گے۔ وہ میری راز دار ہے۔ ہم وہاں شادی رچالیں گے۔ باقی گھر کا معاملہ خالہ خود سنبھال لے گی۔ کل رات کو تم تیار رہنا۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔“

اجمی نے بڑے زور شور اور پورے اعتماد سے کل ڈونگا گلی جا کر شادی کر لینے کا دعویٰ کیا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے وہاں سے واپس چل پڑا۔ ہوٹل میں آکر وہ باہر جان پھر کی طرح اپنے ٹھنڈے بستر پر گر پڑا۔ اس نے گھڑی دیکھی اس وقت رات کے پورے دو بج رہے تھے، اور راولپنڈی کو پہلی بس پانچ بجے چھوٹتی تھی۔ کمرے میں سارے گری نیند میں سو رہے تھے۔ اجمی نے باقی رات بستر پر لیٹے لیٹے سگریٹ پھونکنے گزار دی۔ جب بالکونی کے باہر کھڑکی کے نشیوں میں صبح کی نیلی جھلکیاں نمودار ہوئیں تو وہ آہستہ سے اٹھا۔ بستر بغل میں دبا کر اچھی کیس ہاتھ میں لیا اور سب کو سوتا چھوڑ کر چپکے سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ سڑھیاں اترتے اُسے ہیرا مارا۔

”آج کل کچھ نہیں بھی تو بتاؤ۔“

چنانچہ ایک دن بعد سارا بھید کھل گیا۔ صوفی دوڑا دوڑا پریشانی کے عالم میں ہمارے کباڑ خانے میں آیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔

”نیچے سپاہی آیا ہے۔ یہ کیسے اجمی نے کیا نکل کھلا دیا۔ وہ مجھ سے اجمی کا ناپتا پوچھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ محلے کا چوہدری بھی ہے۔“

جادو سے نے بڑے اطمینان سے سگریٹ کی راکھ بھاڑی۔ ماؤ ایک دم زور ہوگی۔ خواجہ کی پھولی بوئی ناک سکڑ گئی۔ ماؤ کھڑا بالوں میں گنگھی کر رہا تھا۔ وہ کسم پھوڑ کر میدم سا ہو کر پٹنگ پر بیٹھ گیا۔

”اب کی ہو گا؟“

صوفی بولا۔

”یہی تو میں پوچھنے آیا ہوں۔“

خواجہ نے کہا۔

”اُسے کہہ دو اچھی نام کا کوئی آدمی یہاں نہیں ہے ایک مسافر آیا تھا۔ وہ جاچکا نہیں۔

اس کا پتہ غلط غلط لکھا اور۔“

صوفی نے پانی کا گھونٹ پیا اور گھبراہٹ میں بولا۔

”جھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ پولیس کا معاملہ ہے کہیں تھانے لے جا کر ٹھکانے نہ کر دیں۔“

جادو بھالو قلعہ لگا کر ہنس پڑا۔ صوفی نے اُسے ایک موٹی سی گالی دے کر کہا۔

”میری جان پر بی بی ہے اور تو ہنس رہا ہے۔ سالونہ تم میاں آتے نہ مجھے یہ مصیبت

پڑتی۔ وہ کہینہ جاتے جاتے کمرے کا کرایہ بھی ہضم کر گیا۔ یا اللہ اب کی کروں؟“

جادو بولا۔

”پیارے خواجہ نے جو نہیں کہا ہے وہی کرو۔ رام بھلی کرے گا۔“

مہم سبھوں نے کہہ سن کر جادو سے کو راضی کیا کہ وہ صوفی کے ساتھ نیچے جا کر پولیس

والے کو سمجھا دیا کہ حضرت کمرے اور اس بن بلائی بلا کو ہمارے سر سے ڈالے جادو

نے نیچے جا کر سپاہی کو بتایا کہ ہمارے کمرے میں اچھی نام کا کبھی کوئی آدمی آکر نہیں ٹھہرا۔ اسی تھی اس میں خواجہ دیگر اور ہمارا گول مٹول یا ماؤ دونوں بیٹھے تھے خواجہ حسب

صوفی نے بیان درج کر دیا کہ اس نام کا مسافر ہوٹل میں اگر ٹھہرا ضرور تھا۔ لیکن وہ اپنا ادات انگلیاں چٹخ رہا تھا اور ماؤ سکڑی ہوئی آنکھوں کی درزوں میں سے باہر وادی

آتا بتاتے بغیر حساب چکا کر پرسوں میاں سے جا چکا ہے۔

سپاہی نے بیان لکھ لیا۔ چائے کے دو پیالے پی کر پورا ایک ہڑپ کر گیا

جاتے ہوئے اتنا کہہ گیا۔

”ہو سکتا ہے آپ کو ایک بار تھانے آنا پڑے۔“

تھانے کا نام سن کر صوفی کے پران خشک ہو گئے۔ لیکن اس وقت تو اس نے

باہی کے چلے جانے پر کلمہ شکر ادا کیا۔ اسی رات صوفی نے انٹورنس کمپنی کے ایجنٹ

پاچھے پی کر اچھی کو وہ منقلط سناہیں کہ اگر وہ موجود ہوتا تو صوفی کا کچھ نم کال دیتا۔

مذر سے وہ بڑا گھبرایا ہوا تھا۔ اُسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ اب تھانے سے بلاوا

یا کہ آیا۔ اتفاق سے سی آئی ڈی ہ ایک کارندہ ساتھ والے ہوٹل میں چائے پینے آ

کھا۔ صوفی کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اب اس کے ہوٹل کی خیر

ہڈرا ہوا تھا سی آئی ڈی کا نام سن کر چکر میں آ گیا۔ اُسے اپنی ریلوے کی نوکری ہاتھ سے

وٹتی نظر آئی۔ وہ تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اسی لمحے اعلان کر دیا کہ کل صبح پہلی بس پر

جائے گا۔ خواجہ انگلیاں چٹختے ہوئے بولا۔

”تم لاہور جا رہے ہو۔ جادو انتھیا لگی چلا جائے گا۔ پھر میں یہاں رہ کر کیا کروں گا؟“

صوفی سر میٹ کر رہ گیا۔

”میری جان کے دشمن ایک ایک کر کے سب کھسک رہے ہیں۔ اچھا دوستو

ملے جادو میرے سر پر جو آن پڑی ہے وہ اکیلا ہی بھگتوں گا۔

جادو بھالو صوفی کو دھکا دے کر بولا۔

”مرے کیوں جاتے ہو۔ میں ابھی یہیں ہوں۔“

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ دوسرے دن مری سے راولپنڈی کی جانب جو پہلی بس اڑی

اس میں خواجہ دیگر اور ہمارا گول مٹول یا ماؤ دونوں بیٹھے تھے خواجہ حسب

صوفی نے بیان درج کر دیا کہ اس نام کا مسافر ہوٹل میں اگر ٹھہرا ضرور تھا۔ لیکن وہ اپنا ادات انگلیاں چٹخ رہا تھا اور ماؤ سکڑی ہوئی آنکھوں کی درزوں میں سے باہر وادی

آتا بتاتے بغیر حساب چکا کر پرسوں میاں سے جا چکا ہے۔

سپاہی نے بیان لکھ لیا۔ چائے کے دو پیالے پی کر پورا ایک ہڑپ کر گیا

جاتے ہوئے اتنا کہہ گیا۔

خاتم ہو گیا۔ صرف ایک دفعہ صوفی کو تھانے بلوایا گیا۔ وہاں جا کر صوفی نے اپنا پس

والا بیان دہرایا معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اور ہوٹل سلورنگ پھر اپنی پرانی ڈگر پر چلا پندرہ بیس دن اور گزر گئے۔ صوفی سب کچھ بھول بھلا کر ایک بار پھر اپنی ریشہ دوا میں مصروف ہو گیا۔

سری کا موسم کافی سرد ہو گیا تھا۔ بارشیں ختم ہو چکی تھیں۔ دن بھر ٹھنڈی بخ نما آلود ہوائیں چلا کرتیں۔ ہمارا کام اب صرف تاش کھینا، سیمنٹ ہوٹل یا فٹ میں بڑے سڑک کا نظارہ کرنا اور رات کو نیم اُجاڑ سڑکوں پر میٹر گشت کرنا ہی رہ گیا تھا۔ دو تیسرے کمرے میں جاوے کی محفل نشاٹ بھی لگ جاتی۔ رات گئے تک شعر و نغمہ کا درجہ جتنا جس میں انشورنس کمپنی کا ایجنٹ اور صوفی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ جاوے بھالو کی حالت اب اتنا کو پیسہ چکی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس دلدل سے نکلنے کوشش میں اس میں اور دھنستا جا رہا ہے۔ کبھی وہ بچوں کی طرح رونے لگ جاتا، کبھی وقت میں حیران ہوتا کہ اس ہاتھی ایسے ڈیل ڈول والے آدمی میں اتنی نازک اور دلہنے کی سما کیسے ہو گئی۔

ایک رات کا ذکر ہے کہ اچانک بارش ہو کر بادل چھٹ گئے اور سرد ہوا دانت بچنے لگے۔ اس روز جاوے کا محفل نشاٹ کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ہم سیر کر ہوئے نیچے سنی بنک کی طرف نکل گئے۔ کافی دور تک سیر کرنے کے بعد جب ہم آئے تو ہمارے جسم گرم ہو چکے تھے، اور ماتھوں پر پسینہ آ گیا تھا، رات کے دس بجے تھے اور سڑکیں تقریباً ویران ہو گئی تھیں۔ بسوں کے اڈے پر خالی بسیں چپ چاپ کھڑی سردی میں ٹھہر رہی تھیں۔ بکنگ کے پاس دو ایک مزدور آگ جلانے کے لیے بیٹھے تھے۔ ہم لوہے کے جنگلے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سڑک گھومنے لگے، تو ہمیں ایک آدمی نے روک لیا۔

”کیوں جناب پنڈی سے آخری بس کب آتی ہے؟“
طرہی کے خاکی کبل میں پیٹے ہوئے ڈبیلے پتلے آدمی کی آنکھیں اندھیرے میں ہوئے دیسے کی طرح ٹٹمار رہی تھیں۔ اس کی آواز میں تجسس اور ناامیدی کی جھلک

”پنڈی سے آخری بس تو کبھی کی آچکی ہے کیوں۔ بات کیا ہے؟“
جاوے نے پوچھا۔ وہ آدمی آہنی جنگلے کا سہارا لے کر بولا۔
”جناب میری بیوی راولپنڈی سے آخری بس میں آ رہی تھی۔“
میں نے پوچھا۔

”تم اس وقت اڈے پر نہیں آئے؟“
”مجھے صدمہ چا چانے ابھی ابھی بتایا ہے۔ کہنے لگا۔ بیٹے میرا حافظہ کمزور ہے۔ میں تین شام کو بتانا بھول گیا تھا۔ اب کیا کروں جناب؟ اگر وہ آگئی ہو تو بے چاری کہاں ہوگی۔“
”تم کہاں کام کرتے ہو؟“
”جی میں ٹی کمپنی میں چیپر اسی ہوں اور لوئر بازار والے دفتر میں رہتا ہوں میری بیوی کا رنگ سا نولا ہے، اور داہنے گال پر آنکھ کے نیچے زخم کا نشان ہے۔“
جاوے نے کہا۔

”بھائی اب کیا ہو سکتا ہے۔ تم جا کر آرام کرو۔ اب تو صبح کو ہی معلوم ہو سکے گا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہاری بیوی پہنچی ہی نہ ہو۔“
”نہیں جناب..... میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ ضرور آئی ہے۔ ہماری شادی ہوئے ابھی تین ماہ ہی تو گزرے ہیں جناب.....“
ہم اس پر لیٹان انسان کو یونہی بے معنی دم دلا سادیکر اپنے ہوٹل میں آ گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مری کا سارا شہر ایک کبل پوش بے چین انسان کے روپ میں دیوالوں کی طرح بس کے اڈوں پر اپنی نئی یا ہتھ بیوی کو تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ کمرے میں داخل ہوئے۔ تھے ہی جاوے نے حسب عادت ہاتھ اٹھا کر سگریٹ جلایا اور باہر بالکونی میں منظر اڑھ کر ٹھلنے لگا۔

دروازہ آہستہ سے کھلا اور صوفی نے چوروں کی طرح اندر داخل ہو کر دروازہ پھر سے بند کر دیا۔ جاوے نے گردن کھلاتے ہوئے پوچھا۔
”کیوں اوئے..... کیا پھر کوئی آفت آن پڑی ہے؟“

صوفی آنکھ مار کر مکارانہ مہنتی بہنسا۔

”آفت نہیں..... آفت کی پُرکالہ ہے۔“

”کماں ہے؟“

صوفی نے ہمیں اشارے سے ہلا کر کہا۔

”سائبر کمرے میں ہے۔ میرے پیچھے پیچھے چپکے سے چلے آؤ۔“

سات نمبر کمرے میں ٹوٹی ہوئی میز پر صرف ایک موم جلی جل رہی تھی۔ جس کی دھواں عورت کے منہ کے آگے کر دی۔ دہانے گال پر آنکھ کے نیچے زخم کا نشان آنسوؤں میں بھیک رہا تھا۔ جادوے کے ہاتھ سے موم جلی زمین پر گر پڑی۔ صوفی چیخا۔

”یہ کیا کر دیا۔ تم ہوٹل میں آگ لگا دو گے۔“

جادوے نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ فرش پر کھڑے کھڑے جھوٹا سا موم جلی جل رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ عورت رو رہی ہے۔ صوفی تو ششدر رہ گیا۔ اس کی آواز بھی نہ نکل سکی۔ بس میدے کی بوری کی طرح عورت کی عمر بیس ایکس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دبائی پکڑ کر فرش پر گر پڑا، اور پھر نہ اٹھ سکا۔ جادوے نے آگے بڑھ کر فرش پر گر کر ہوا دوپٹ لیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اب اس کے جو پچی بندھی تو تھکنے کا نام ہی نہ تھا۔ جادوے نے جھنجھلا کر صوفی سے پوچھا۔

”یہ چڑیل کہاں سے اٹھلائے ہو تم؟“

”برقع پہن کر میرے ساتھ آؤ بہن۔ میں تجھے تیرے خاوند کے پاس پہنچا دیتا ہوں۔“ عورت کبھی بکی رہ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ایک دم کیا پلیٹ سی کیے ہو گئی۔ اس بدتماش کے اندر سے نیک دل بھائی کہاں سے نکل آیا؟ اس نے جلدی سے اپنا سفید سیدھا برقعہ اوڑھا اور ہمارے ساتھ ہوٹل سے باہر نکل آئی۔ رات کے اندھیرے میں ہم نے لوئر مال کی اونچی نیچی اترائی سنبل سنبل کر طے کی جادو اسارا راستہ کچھ نہ بولا۔ ہونٹ بیچھے، ہاتھ خاکی برانڈ کی جیسوں میں ٹھنڈے بالکل چپ چاپ چلتا رہا۔ ٹھوڑی ہی دیر بعد ہم ٹی کمپنی کی بیگی ٹیڑھی عمارت کے نیچے کھڑے دسک دے رہے تھے۔ کابک نما دفتر کی تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ صرف ایک کھڑکی میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ غم نصیب غریب خاوند دیا جلائے اپنی نوپا ہوتا بیوی کی راہ دیکھ رہا تھا۔ کسی نے بڑی بے تابی سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے وہی کبیل پوش دہلا آدمی کھڑا تھا۔ اس کی

جادوے کو جیسے بجلی کا ہلکا سا جھٹکا لگا۔

”خاوند سے ملنے آئی ہے۔ کون سی بس سے اتری تھی؟“

”آخری بس کا کمرہ رہی تھی۔ مگر ہم ان اڑن گھائیوں میں آنے والے ہیں بھلا! نہ بولا۔ ہونٹ بیچھے، ہاتھ خاکی برانڈ کی جیسوں میں ٹھنڈے بالکل چپ چاپ چلتا رہا۔ ٹھوڑی ہی دیر بعد ہم ٹی کمپنی کی بیگی ٹیڑھی عمارت کے نیچے کھڑے دسک دے رہے تھے۔ کابک نما دفتر کی تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ صرف ایک کھڑکی میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ غم نصیب غریب خاوند دیا جلائے اپنی نوپا ہوتا بیوی کی راہ دیکھ رہا تھا۔ کسی نے بڑی بے تابی سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے وہی کبیل پوش دہلا آدمی کھڑا تھا۔ اس کی

”تم پینڈی سے آئی ہو؟“

”جی۔“ عورت کی آواز پچیسوں میں دبی ہوئی تھی۔

”تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

بیوی بھاگ کر اس سے جا لپٹی، اور اس کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔ خاوند کی آنکھ میں بھی آنسو آگئے۔ جاوے نے صرف اتنا کہا، اور اس کی اپنی آواز زندہ ہی ہوئی تھی۔
 ”میں تمہاری بیوی کو نہیں اپنی بہن کو اس کے گھر چھوڑے جا رہا ہوں۔“
 جادو جلدی سے مجھے ساتھ لے کر لوئر بازار کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ ٹی کمپنی کا چڑھا
 ہمیں دیکھتا ہی رہ گیا۔

ہوٹل میں واپس آکر جاوے نے کہا۔
 ”اب میں یہاں نہیں رہ سکتا میں کل صبح ہی نکتیا گلی چلا جاؤنگار۔“
 اس کے بعد وہ پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔
 ”بتی بجا کر تم بھی سو جاؤ۔“

میں نے بتی گل کر دی اور بستر میں گھس کر لحاف اوپر کر لیا۔ اندھیرے میں مجھے
 نمک کچھ اس قسم کی آواز سنائی دیتی تھی جیسے جادو اسکیاں بھر رہا ہو۔
 کیا وہ روبرہا تھا؟



شہر اور گلیاں

اس وقت میں چُپ ہوں۔ خاموش ہوں۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے کسی نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے قوت گویا پیچیدگی لی ہے۔ جیسے یہ ہونٹ رنگ اُلو تلے کے دروازے کی مانند بند ہو چکے ہیں۔ اور اب کبھی نہ کھلیں گے میری آنکھوں میں آنسو ہیں۔ اور میرے دل کا ہر درد جاگ اٹھا ہے ہر زخم رس رہا ہے اور ٹلیں اٹھ رہی ہیں۔ اور میں پاگلوں کی طرح کھوئے کھوئے قدم اٹھائے اس دیران اور خاموش پگڑنڈی پر چلی جا رہی ہوں۔ یہ پگڑنڈی دونوں طرف سے درختوں سے گھری ہوئی ہے۔ اور ٹہنیاں سر جھکائے چپ چاپ سوچ رہی ہیں آج ہر جانی پہچانی چیز اجنبی نظر آرہی ہے۔ یہ وہی راستے ہیں جہاں سے میں دنیا گزرا کرتی ہوں۔ یہ وہی پہاڑ ہیں۔ جو مہربان محافظوں کی طرح سینہ تانے کھڑے روزانہ راستے میں مجھے ملا کرتے تھے۔ مگر آج میں ان کو قطعاً نہیں پہچان رہی۔ یہ آبشار جو کل تک میٹھے میٹھے راگوں سے بھر پور تھا۔ آج اپنا سر پتھروں سے کیوں پٹخ رہا ہے۔ وہ شفقتی..... زمرودی..... نارنجی..... فیروزہ..... کاسنی اور سرمئی رنگ کے بادل یہاں سے چلے گئے..... لیکن دادیوں میں

زرد چاند میں رہنے والی اداس لڑکی
میں تمہاری ڈائری کے یہ پریشان اوراق
تمہارے ہی نام معنون کرتا ہوں

نوکراتی دروازے کے پاس فرش پر اونگھ رہی ہے۔ غزالہ اور نیلو فر کے کمرے سے ریڈیو سیلون کی آواز آرہی ہے۔ ننھا نعمان اور بے بی سلمی بھیتا کے کمرے سے چرائے ہوئے رسالوں میں سے موٹے موٹے بچوں۔ بلیوں اور طوطوں کی تصویریں کاٹ رہے ہیں۔ ہر ایک ہنس رہا ہے۔ ہر ایک خوش ہے۔

لیکن مجھے چین اور سکون نہیں ہے۔ میرا دل ایک لمحہ کے لیے بھی ان کے پاس بیٹھنے کو نہیں چاہ رہا۔ اور میں گھبرا کر باہر نکلی آتی ہوں۔ جب اکٹھ میں آئیں تو ہوں۔ اور دل درد سے بھرا ہوا ہوں۔ تو ساری دنیا اداس اور تاریک نظر آتی ہے۔ اس وقت صرف تنہائی ہوتی ہے اور اچھی لگتی ہے۔ اور تسلی دیتی ہے۔ اور ہر درد کو سنتی ہے۔

میں چلتے چلتے بڑی مشکل سے چپڑ کے ان گھٹے درختوں تلے آ پہنچی ہوں اور چپ چاپ پاگلوں کی طرح سامنے والی پگڈنڈی کو دیکھ رہی ہوں۔ ساری وادی تاریک نظر آرہی ہے۔

میری پیاری سہیلی! میری بدنصیب زاہدہ! آج تیری حالت نے مجھے شعلے کی طرح مضطرب کر دیا ہے۔

آف لاپرواہ پاگل لڑکی! تو نے کتنی بے دردی سے اپنی زندگی کو جلا ڈالا ہے۔ اور آج تو ایک سیٹی ٹویم کی سرد تاریک اور ویران تنہائی میں دم توڑ رہی ہے۔ مر رہی ہے۔ . . .

تو یونہی مر جائے گی۔ یونہی ایک خون ہو جائے گا۔ ایک جان چلی جائے گی۔ ایک قیمتی اور پیاری زندگی برباد ہو جائے گی۔ اور کسی کو علم نہ ہو گا۔ کوئی جان نہ سکے گا۔ کچھ نہ ہو گا۔

کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ سورج یونہی طلوع و غروب ہوتا رہے گا پھول یونہی مرجھا کر تازہ ہوتے رہیں گے۔ ہزاروں لڑکیاں محبت کریں گی۔ مگر زاہدہ دوبارہ واپس نہ آئے گی۔ کچی ہوئی محبت میں کبھی زندگی پیدا نہ ہوگی۔ شاخ سے ٹوٹا ہوا پھول

اُتر گئے! وہ رنگ یہاں اڑ گئے۔ وہ سورج یہاں ڈوب گیا ہے۔ . . . جو کل تک آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ یہ ایک ہی دن میں کیا ہو گیا ہے۔ وہ دل کشی، وہ رعنائی کہاں کھو گئی۔ . . . زندگی کی چمک۔ . . . روشنی۔ . . . اور سیلاب کیوں مٹ گیا! وہ سارا حسن کہاں مر گیا! . . . کیسی موت مر گیا!

سارے گھر دالے مزے سے اپنے اپنے کاموں میں محو ہیں۔ بھیتا اپنے کمرے میں بیٹھے ستار پر کوئی دھن چھیڑ رہے ہیں۔

باجی اپنی توس قزح کے رنگ کی قمیض پر استری کر رہی ہے وہ ساتھ ساتھ اپنے آپ مسکراتی بھی جاتی ہے۔ اور استری بھی کرتی جاتی ہے۔

باجی بڑی خوش ہے۔ آج باجی اپنے منگیز ظفر بھیتا کے ساتھ سینما دیکھ جا رہی ہے۔ دونوں روزانہ جاتے ہیں۔ کبھی سیر کو۔ کبھی سینما۔ کبھی شاپنگ، کبھی کسی پارٹی پر، کبھی کپنک پر۔ . . . دونوں ایک دوسرے سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ . . . دولت نے دولت کو گلے لگایا ہوا ہے۔ ورنہ یہ کبھی پیار نہ کرے اگر ظفر بھیتا کی . . . روپے تنخواہ ہوتی۔ اور کار اور کوٹھی اور بینک بلیس نہ ہوتا یہ سنگتی کبھی نہ ہو سکتی۔ یہ سینما دیکھنے کبھی نہ جاسکتے۔ . . . یہ ایک دوسرے سے کبھی نہ مل سکتے۔ پھر ایک دوسرے سے ملنے کے لیے انہیں آگ اور خون سمندر تیرنا پڑتا۔ اور ان کے چہرے زرد ہوتے۔ لیکن مائے بچا رحلیل! وہ باجی پر کس قدر مرتا تھا۔ . . . لیکن وہ باجی کو کبھی نہ پاسکے گا۔ وہ باجی کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتا۔ . . . اس لیے کہ وہ غریب ہے۔

اور غریبی دنیا میں انتہائی خوفناک اور بُری چیز ہے۔

دادی اماں کی ایرانی بلی مزے سے صوفے پر سو رہی ہے اور ہماری

اور کمان سے نکلا ہوا تیر کبھی واپس نہیں جائے گا۔

لیکن زاہدہ! آج تیرے چہرہ پر کس قدر سکون ہے۔ ایسا سکون تو بچپن کا بھی کبھی تمہارے چہرہ پر نہیں تھا۔ تو اب کیسے اتنی مطمئن ہو گئی ہے! تیرے ساکڑ اور منہ لبوں پر آج زندگی کی کوئی تلخی اور شکایت نہیں ہے۔ تجھے کسی سے کوئی گناہ نہیں ہے۔ تیرے ہونٹوں پر دکھ درد کی کوئی مسکائی نہیں ہے۔ زندگی ٹھٹھک کر سینے کی قبر میں دفن ہو چکی ہے۔

اور تو سینی ٹوریم کی آندھی تنہائی میں اطمینان سے لیٹی دنیا کو اس راہبہ کی نظر سے دیکھ رہی ہے۔ جو ہر چیز کی حقیقت کو پہنچ چکی ہو۔ تیری پہلی موت سے لے کر اب تک تجھے سکون حاصل نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب تو ایسی آخری موت مر رہی ہے۔ جس کے بعد تجھے کوئی دکھ نہیں ملے گا۔ خوف و سکون ملے گا۔ زندگی نہیں ملے گی۔ صرف موت ملے گی۔ سرد اور سیاہ موت!

اور پھر تم نے زندگی کو کرنا بھی کیا ہے؟ زندگی نے تمہیں دیا ہی کیا ہے جس کے چھین جانے کا تمہیں افسوس ہو گا، تیرے لیے تو موت زندگی کا پیام ہے۔

اف زاہدہ! موت، کا استقبال یوں سکون اور اطمینان سے کرنا۔ یہ نہ جانے کن لوگوں کا حصہ ہے۔ یہ تم جیسے لوگوں کا حصہ ہے۔ یہ بدنصیب دکھی روجوں کا حصہ ہے۔ سچائی کی پرستار روح کا حصہ ہے۔ جن لوگوں کو زندگی دکھوں کے سوا کچھ نہیں دیتی۔ ان کے لیے موت خوشی کا پیغام لاتی ہے جیسے ایک مدت کا بچپن ہوا بچہ اچانک اپنی ماں سے جا ملے۔

میری بدنصیب زاہدہ! میری غریب سہیلی! میں تمہارے لیے کچھ نہ کر سکی۔ . . . میں تمہارے لیے کچھ نہ کر سکوں گی۔ . . . اور تمہیں یونہی چپ چاپ مرتے ہوئے دیکھوں گی۔

دیکھ! میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ میرا دل پگھل کر میری آنکھوں میں آ رہا ہے۔

اچھی زاہدہ! کیا آج سچ سچ میں نے تمہیں ہی دیکھا تھا! لیکن سچ سچ تم ہی زاہدہ ہونا۔ جس کی گمراہی اور شفاف خوبصورت آنکھوں میں زندگی سورج بن کر جھانک کر تھی تھی۔ اور جس کے معصوم بھولے بھالے چہرے پر فرشتوں کی سہیلی پائیزگی تھی۔

لیکن نہیں۔ وہ زاہدہ آج کہیں نظر نہیں آ رہی۔ آج تو زندگی کی راہ پر کوئی بھٹکی ہوئی دکھی روح نظر آتی ہے۔ جس کے ارد گرد دور دور تک روشنی کا کہیں نام و نشان نہیں۔ صرف اندھیرے کے صحرا پھیلے ہوئے ہیں۔

آؤ اچھی زاہدہ! آؤ ہم اس پیاری لڑکی زاہدہ کو دوبارہ کہیں ڈھونڈیں۔ جسے میں کبھی نہ بھلا سکوں گی۔ اس معصوم اور پیاری زاہدہ کو ڈھونڈیں۔

تب تم ہمارے اسکول میں نئی نئی داخل ہوئی تھیں۔ اور تم سارا دن چپ چاپ اور اداس چہرہ لیے آخری سیٹ پر بیٹھی رہتی تھیں۔ تمہاری کوئی سہیلی نہیں تھی۔ اور تم اپنا بھولا بھالا تلخ چہرہ اوپر اٹھائے سب کو دیکھتی رہتی تھیں یونہی دو تین مہینے گزر گئے۔ اور جب امتحان ہوا تم فرسٹ آگئیں۔ تو ہر لڑکی نے تمہیں چونک کر دیکھا۔ تو پھر بہت سی لڑکیاں تمہارے قریب آ گئیں۔ اور تم میں دلچسپی لینے لگیں۔ انہی میں ایک میں بھی تھی۔ استانیات تمہاری بہت تعریف کیا کرتی تھیں۔

اور پھر آہستہ آہستہ اسی طرح میں تمہارے بہت قریب آئی گئی۔ مجھے دیکھ کر تمہارا اداس سا چہرہ کھل اٹھتا تھا۔ جیسے مویٹے کے پھول کو چاندنی میں ہنلا دیا گیا ہو۔

ایک روز کلاس میں لٹٹ تھا۔ اور تمہارے پاس نہ پسل تھی اور نہ پن۔ اور تم پریشان سی ہو گئی تھیں۔ کسی سے ملنے کی تم میں جرأت نہیں تھی۔ اور تم نے سب کو ایک نظر سے دیکھا۔ اور میری طرف دیکھ کر تمہیں نہ جانے کیوں جیسے کچھ سہارا ہو گیا اور میں نے ڈھک سے دوسرا پن نکال کر اسی وقت تمہیں دے دیا۔ پہلے تم لینے سے بچکی تھیں اور مجھے انتہائی احسان مند نظروں سے دیکھا۔ لیکن پھر تم نے جلدی سے

پین لے کر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

حالانکہ مجھے تم سے ہمیشہ گلہ رہا۔ مگر تم نے اس مہربانی کو کبھی فراموش کیا۔

تیم دلائی تھی۔ مگر یہ چار سالوں میں ہی کیا کیسے پلٹ گئی۔
آج نہ تمہاری والدہ زندہ ہے۔ نہ دادا۔ اور تمہارا چھوٹا بھائی اور تمہاری پیاری بہن جسے تم نے لیڈی ڈاکٹر بنانا تھا۔ وہ رشتے کی ایک خالہ کے ہاں رہتے ہیں۔

جہاں سارا دن گھر کا کام کرتے رہتے ہیں۔ تب کہیں جا کر ان کو ردی ملتی ہے۔
زائدہ! کیا تمہیں ان کا بھی کوئی خیال نہیں!!
تمہاری زندگی میں ایسا کون غلام اور بے رحم شخص داخل ہوا جس نے ان واحد میں ذخیرہ کو نپوں کو جڑ سے اکھڑ کر رکھ دیا۔ ایسی کونسی آندھی چلی۔ جس نے سارے چین کو ابنا کر رکھ دیا۔

تمہاری زندگی کا سورج وقت سے بہت پہلے کیوں ڈوب گیا؟ صبح سویرے چھوٹے بھائی اور چھوٹی بہن کو بہت اعلیٰ تنسیم دلاؤ گی۔ اور یوں تم لوگوں کے اچھے دوست بن جائیں گے۔ اور تم لوگ آسودہ اور خوشحال زندگی گزار سکو گی۔ اور تمہاری یہ بہن اور تمہیں نگل رہی ہے۔

ان سالوں میں تمہاری دنیا بسی بھی اور اجڑی بھی۔
اور زائدہ! میں نے تمہیں اپنی دوست کہا۔ اپنی بہن کہا۔ اپنی سہیلی کہا۔ اور پھر تمہاری کوئی خبر نہ لی۔ کوئی حال نہ پوچھا۔ میں ان ۴ سالوں میں تم سے بہت دور ہو گئی تھی۔

کاش! میں دور نہ جاتی تو تمہاری دنیا کو اجڑنے سے ضرور بچا لیتی۔
کچھ تو کرتی۔

آج میں اپنا پشیمان چہرہ لیے یہاں بیٹھی ہوں۔
وقت گزر رہا ہے۔ اور جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے میرا دل ویران سے ویران تر ہوتا جا رہا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں گھر والے مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ اور میں یہاں اتنی دورانی اپنی چوٹی پر یکب سے تنہا بیٹھی ہوں۔

یہاں کتنی بلندی اور رفعت ہے۔ اگر یہاں سے کوئی گرے تو اس کی ہڈی پسلی

تم ایک چھوٹے سے مکان میں اپنے غلام دادا۔ بوڑھی والدہ اور ایک چھوٹے بھائی اور ایک چھوٹی بہن کے ساتھ شہر کے تنگ و تاریک محلے میں رہا کرتی تھیں۔
تم سے اپنی بوڑھی ماں کو محنت و مشقت کرتے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ جو ۳۵ سال کی عمر میں ہی سفید بالوں والا سر بیسے ۶۰ سال کی بوڑھی عورت معلوم ہوتی تھی۔ تمہارا دادا بڑا ناخوش تھا۔ جو تمہاری پڑھائی کے سراسر خلاف تھا۔ مگر تم کسی نہ کسی طرح پڑھ رہی تھیں۔
تم بہت جلد پڑھ کر اسٹانی بن جانا چاہتی تھیں۔ اور پھر تمہارا خیال تھا کہ تم اپنے چھوٹے بھائی اور چھوٹی بہن کو بہت اعلیٰ تنسیم دلاؤ گی۔ اور یوں تم لوگوں کے اچھے دوست بن جائیں گے۔ اور تم لوگ آسودہ اور خوشحال زندگی گزار سکو گی۔ اور تمہاری یہ بہن اور تمہیں نگل رہی ہے۔
بڑی خواہش تھی کہ اس کے بعد تم ساری دنیا کے سفر کو جاؤ گی۔ تم مجھے بتایا کرتی تھیں کہ تمہیں دنیا کو دیکھنے کا بے حد ارمان ہے۔ اور تم اس وقت تک کبھی نہیں مرو گی۔ جب تک کہ تم ساری دنیا کو نہ دیکھ لو گی۔ تم نے اپنے پاس کچھ خوب صورت سینریاں رکھی ہوئی تھیں۔ جو تمہارا سب سے قیمتی سرمایہ تھا۔ اس میں ایک تصویر دریائے نیل کی تھی۔ اور تمہیں مصر جا کر دریائے نیل دیکھنے کی کس قدر آرزو تھی! یہ کوئی تم سے کچھ دور میں تمہیں ہمیشہ یقین دلا کرتی تھی۔ کہ ہم دونوں اکٹھی جائیں گی۔

مگر تم ہمیشہ یہ سارا کچھ کہہ کر اداس ہو جایا کرتیں۔ تمہیں پتہ تھا کہ یہ صرف خواب ہی ہے۔ کہاں بمشکل تمام دو وقت کی روٹی اور کہاں دریائے نیل کی سیر۔ لیکن میں اس خواہش کا ہمیشہ احترام کیا کرتی تھی اور کہا کرتی تھی۔ کہ میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گی۔ میرے ڈیڈی نے مجھ سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ وہ مجھے سمندر پار کے تمام شہر دکھائیں گے۔ اور تم چپ ہو جایا کرتیں۔

اچھی زائدہ! تم نے تو ابھی ساری دنیا کی سیر کرنی تھی۔ اور سارے خاندان کو اٹھا

سُرمہ ہو جائے تو بھی پتہ نہیں کس بلندی سے گری ہے! کہاں سے گری ہے۔

تجھے گرانے والا کون ہے؟ کہاں ہے؟

اس نے تجھ سے کیسا بدلہ لیا ہے؟

تو نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟؟

وہ مجھے مل جائے پھر دیکھنا کہ میں اس کا کیا حال نہیں کرتی۔
تمہارے کسی کام نہیں آسکی۔

زاہدہ! مگر اتنا وعدہ کرتی ہوں کہ اگر وہ مجھے اس زندگی میں کہیں مل گیا۔ تو تیرے
سارے بدلے چکا دوں گی۔ ضرور چکا ڈل گی۔ مجھے اب کوئی داپس چلنا چاہیے۔

آج بہت دنوں کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ مسلسل پندرہ روز تک بخار آتا
رہا۔ کمزوری کتنی زیادہ ہو گئی ہے۔ بڑی مشکل سے بیٹھی ہوں۔ جس دن سے
ابہرہ کی موت کی خبر سنی ہے اور اس کا خط پڑھا ہے جو معہ ایک ہنڈل کے
لا تھا اس دن کے بعد سے پھر ہوش نہیں رہی۔ آج دل کچھ آرام اور سکون سے ہے
اور بخار بھی نہیں ہے۔

سارے گھر والے پریشان تھے۔ ڈیڈی کو باہر ددرے پر جانا تھا۔ مگر
میری وجہ سے وہ بھی نہیں گئے۔ وہ انتہائی طور پر فکرمند تھے۔

امی سارا وقت میرے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ باجی اور ظفر بھیا دونوں چپ چاپ
سے ہو گئے تھے۔ ان کے پروگرام بننے کے بنے رہ گئے تھے۔

ان سب گھر والوں کو میرے اپنے گھر والوں کو میرا کس قدر خیال ہے اپنی بیٹی
سے کتنا پیار ہے۔

مگر زاہدہ تیرا خیال کرنے والا! اس بھری دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ کوئی نہیں تھا
جو ایسا مر گئی۔ مرتے وقت بھی تیرے پاس کوئی نہیں تھا۔ پتہ نہیں تو ایسے لمحوں میں

کیا سوچتی ہوگی! تیری سوچیں دکھتا ہوا انگارہ ہوں گی۔ جنہوں نے تمہیں جلا کر اسے آزاد ہو کر دھڑک رہا ہے۔ ٹھٹھہ رہا ہے۔ تو کیوں نہیں خوشی ڈال۔

زاہدہ! تیرا خط اور خط کے ساتھ یہ چھوٹا سا بندل میرے سامنے رہا ہے۔ کیا تیری بھی کوئی بہن اور بھائی تجھ سے کہیں بہت دور بیٹھے پڑا ہے۔ تیرا خط پڑھتی ہوں تو بندل کو کھولنے کی جرات نہیں کر سکتی کسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آج تو مجھے آخری بار اس بستر پر دیکھ رہی ہے نے مکھا ہے۔

رات کی سرد ہواؤ! میرا پیارا میری بہن نسیم اور میرے بھائی انجم کے لیے لے جاؤ میرا اتنی کی قبر پر جا کر بوسہ دو۔

اے آسمان کی پیشانی پر چکنے والے ستارو! میری زندگی ختم ہو رہی ہے۔ مگر تم اسے کبھی نہ بتانا۔ کہ وہ زاہدہ آج مر گئی۔ جسے تو نے اپنا کہا تھا۔ اور زندگی بھر ساتھ بچا ہونے کا وعدہ کیا تھا۔

میری سہیلی نجمہ! خط کے ساتھ یہ چھوٹا سا بندل بھی تمہیں بھیج رہی ہوں۔ اس میں میرے کچھ خط۔ اس کے خط۔ میری ڈائریاں۔ کچھ یادیں اور کچھ ادبیاں بھری ہوئی ہیں۔ تم ان سب کو رکھ لو۔ اور اگر کبھی تمہیں اس دنیا میں ”وہ“ کہیں مل جائے۔ تو اسے کبھی نہ بتانا کہ زاہدہ

مرحی ہے۔ اسے کبھی نہ بتانا کہ زاہدہ تو اسی روز مر گئی تھی۔ جس دن اس نے اسے چھوڑ کر اپنی پھوپھی کی لڑکی ثمنہ سے شادی کر لی تھی۔ تم وعدہ کر دو کہ تم کبھی اسے نہیں بتاؤ گی۔ میری ان سب یادوں کو پڑھنے کے بعد جلا دینا، رکھ کر دینا۔ میں جیتے جی ان کو رکھ میں تبدیل نہ کر سکی۔ خود رکھ ہو گئی۔ مگر

پیاری نجمہ! پرسوں تمہیں دیکھا۔ ایک طویل مدت کے بعد تمہیں دیکھا۔ تم میری اس آخری خوشی کا کبھی اندازہ نہ لگا سکو گی۔ جو تمہارے اور پیارے چہرے کو دیکھ کر مجھے حاصل ہوئی۔ زندگی تمہارے لیے کتنی خوبصورت اور آسودہ خواب ہے۔ خدا کرے۔ تم ساری زندگی اسی خواب کی چھاؤں سے سے بسر کر سکو۔

میں مر رہی ہوں۔ اور میری زندگی کے چند سالس باقی رہ گئے ہیں اس دنیا میں کبھی واپس نہ آؤں گی۔ نہ تمہارا پیارا چہرہ دیکھ سکوں گی۔ نہ نیلا آسمان نہ درخت۔ نہ اپنے چھوٹے بہن بھائی جو یہاں سے بہت دور رشتے کی پاس بیٹھے اس وقت نہ جانے کیا کر رہے ہوں گے۔ خدا جانے ان کا کیا حال ہو گا۔۔۔۔۔ خالہ جب میرے سامنے ان کو مارتے سے فرق نہ کرتی تھیں۔ تو ان کا کیا نہ حال ہوتا ہو گا۔ نجمہ! یہ خیال، یہ سوچ۔ یہ تصور، مجھے شاید قبر میں جین سے نہ بیٹھنے دے گا۔

کاش! وہ دونوں بھی میرے سامنے مر جاتے تو اچھا تھا۔ کتنا اچھا تھا ہم لوگوں کے لیے زندگی سے زیادہ اچھی ہوتی۔ مجھ سے زیادہ باتیں نہ ہو سکیں گی نجمہ! کھانسی رکھنے کا نام نہیں ہے۔ میں تمہیں کھتی جا رہی ہوں رات ہو رہے ہو بیت رہی ہے، یوں لگتا ہے آج کی رات میری زندگی کی آخری رات ہے۔ اے دکھوں سے بھری ہوئی لمبی۔ کالی اور پریشان رات! تیرا دل کرا

تم میرے مرنے کے بعد ان کو راکھ میں بدل دینا
تاکہ ہم ایک ہو جائیں۔

اور نجمہ! میری پہلی! وعدہ کرو۔ تم نسیم اور
انجم کی زندگی کا میرے بعد ضرور خیال رکھو گی۔ اب
الوداع میری دوست! الوداع... الوداع... الوداع۔

۱۵۔ نومبر۔

آج اسکول میں ہم سب لڑکیاں بہت ہنستی رہیں۔ بہت دنوں کے
ہی میرے لبوں تک آئی تھی۔ مجھے سنتے ہوئے بڑا ڈر لگا کرتا ہے
اور خوشی ہماری قسمت میں کہاں ہے۔ لیکن پھر بھی جب منور، ثریا
ت اور زریہ نے لطیفے سنائے، نقلیں اتاریں اور خوب خوب ایٹنگ
نئی کے مارے بڑا حال ہو گیا۔ اور مننے سے کچھ دیر پہلے جو مجھے سردی
رہی تھی وہ دور ہو گئی۔ یہ تو فائدہ مند ہنسی ثابت ہوئی سردی کتنی زیادہ
ہی ہے۔ مگر میرے پاس کوئی گرم کپڑا نہیں ہے۔ صرف ایک سویٹر ہے
اس کے پاس کتنے خوبصورت سویٹر اور کوٹ ہیں۔ مگر ہمارے پاس کچھ نہیں
۔ آج صبح عشرت مجھے کہہ رہی تھی۔ زاہدہ! تم گرم چادر لے کر کیوں نہیں
لیا تمہیں سردی نہیں لگتی۔ اور میں نے ہنستے ہوئے اسے کہا تھا۔

نہیں ہے کوٹ کی حاجت نہیں ہے

کہ میں حلوے سے گرمائی گئی ہوں

اور وہ ہنس دی تھی۔ میں بھی ہنس دی تھی۔ میں تو اب بھی ہنس رہی ہوں۔

تو نے جو ظلم مجھ پر کیے ہیں۔ میں نے صبر کے ساتھ سارے برداشت کئے ہیں۔ میں نے آف تک نہیں کی۔ یونہی ساری جوانی تیرے ظلموں تلے کاٹ دی، مگر اب بیٹی کے ساتھ یہ ظلم نہیں ہونے دوں گی۔ میں اس نامرادانیوں کے ساتھ اپنی چاندسی بیٹی کبھی بیاہنے نہ دوں گی۔ جا، آج میں بھی تجھے صاف کہے دیتی ہوں۔ آج تیرا لی نظ بھی ختم ہو گیا ہے اب تو میری بیٹی کے ساتھ ظلم نہیں کر سکتا۔

دادا جان نے یہ سنتے ہی چوہلے سے آدھ جلی لکڑی نکالی اور مارنے ہی لگے کہ میں اوپر چلی گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ لکڑی والدہ کو مارنے کی بجائے میری طرف ہر آئے۔ اور زور سے میری پیٹھ پر مار دی۔ ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ مگر اسے کھڑا نہ ہوا جاسکا میں گر پڑی۔ . . . ہسالیوں کی باتیں۔ اتنی کے نے کی آوازیں۔ یہ سبھی کچھ دور کنوئیں سے آتا ہوا محسوس ہوا۔ رات گئے تک دل کی طاری رہی۔ اور پھر ہوش میں آگئی، میں روتی رہی۔

یا خدا تو نے مجھے کس گھر میں پیدا کر دیا ہے! اگر اس گھر میں پیدا کرنا تھا تو ایسا دل کیوں دیا! دل کے اندر ایسی آرزوئیں کیوں پیدا کر دیں؟ علم سے محبت کیوں دے دی؟ یہ کتنا ظالم دادا ہے! بوڑھا ہو گیا ہے، مگر ابھی نہیں۔ کتنے عرصے سے ظلم کر رہا ہے! اوروں کے گھر میں یہ ظلم نہیں ہوتا۔ ہمارے گھر میں کیوں ہوتا ہے؟ ہم نے کونسا گناہ کیا ہے؟ کیوں سزا مل رہی ہے؟ یہ ظلم کیوں ہوا؟ اسے نہیں ہونا چاہیے۔ میں کرنے والے کو خود مٹا دوں گی۔ ہمیں بھی دنیا میں خوش رہنے کا حق حاصل ہے۔ میں کل ہی اتنی سے کہوں گی۔ ہم اس گھر کو چھوڑ کر کہیں اور چل دیتے ہیں۔ یہ دادا نہ ہو۔ اور لڑکیاں کتنی خوش رہتی ہیں۔ ان کے والدین ان کو پڑھنے

لیکن اس میری ہنسی میں وہ جھنکار اور موسیقی کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ اکثر ہنسی کا آواز سے ڈر ہی لگتا ہے۔ لیکن اور لڑکیاں تو بڑی پیاری آواز سے ہنستی ہیں تو اپنی ہنسی پر ہمیشہ یہی گمان ہوا ہے کہ جیسے ظالم اور بے رحم مامکے کے چینی برتن اٹھا کر لے جا رہی تھی۔ کہ چھن سے ٹوٹ گئے ہیں۔ یہ کیا ہو گیا ہے؟ اور خوف سے دھڑکنے لگتا ہے۔

آج بھی سارا دن ہنستی رہی۔ تین بجے چھٹی ہوئی اور میں گھر آئی ابھی بیڑہ ہی میں تھی کہ ادھر سے دادا جان کے گرجنے کی آواز سنائی دی۔ میرا دل دھڑکنا ہو گیا۔ ہونٹ خشک ہو گئے اور میں کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ سیڑھیاں چلنے لگیں۔

میرا دل غم کی گہری داریوں میں ڈوب گیا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کیوں ہنسی۔

میں آدھی سیڑھیاں چلے کر کے سانس روک کر کھڑی ہو گئی۔ دادا جان کیا کہہ رہے تھے۔

میں کہتا ہوں۔ جب وہ اچھا بھلا کماؤ مرد ہے۔ اپنی دکان کرتا۔ پیسے روز کما کر لے آتا ہے۔ کیا ہوا جو اسے بھنگ اور افیون کا شہ کرنے عادت ہے۔ تو زاہدہ کی بات دہاں پچی کیوں نہیں کرتی۔ . . . میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ کب تک انتظار کروں! تو بیٹی کو اسکول بھیج کر ہماری داغدار کر رہی ہے۔ حرامزادی! دیکھ میں تجھے کیسے ٹھیک نہیں کرتا۔ گھر سے نکال باہر کروں گا۔

آج زاہدہ کو آ لینے دو۔ جو اس گھر سے اس نے پھر باہر قدم یا رہنے جاتی ہے۔ اسکول کیا جاتی ہوگی۔ بھلا کبھی شہ کی بہو بیٹیاں بھی گھر سے نکلی ہیں۔ ہم نے کونسی نوکری کرانی ہے!! اور اتنی کہہ رہی تھیں:

سے کبھی منع نہیں کرتے۔

کل میں آسیہ کے گھر اس کی کتاب پڑھنے کے لیے لینے گئی
کا گھر کتنا بڑا ہے؛ کتنا خوبصورت سجا ہوا ہے۔

کاش! ہمارا بھی ایسا گھر ہوتا! اس کی اتنی نے کتنے اچھے کپڑے پہن
تھے۔ نوکر کام کر رہے تھے۔ اور پھر نیچے کمرہ میں جب میں آسیہ کا
سمجھ کر اندر چلی گئی۔ اور صوفہ پر ڈرتے ڈرتے بیٹھ گئی تھی۔ اور پھر میں
کی تصویریں دیکھنے میں اس قدر محو ہو گئی کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا۔ کب اس کا ہ
کر سامنے بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے اور مجھے گہری نظروں سے تنگ رہا۔
جب میں نے اس کو دیکھا تو چیخ میرے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اور
گئی اور میرا حلق خشک ہو گیا۔ اور میں اٹھ کر بھاگنے لگی تھی۔ کہ اس نے
سے پکڑ کر بٹھایا۔

آپ کو پسند ہیں! آپ لینا چاہیں تو لے سکتی ہیں۔ آسیہ نے بتایا تھا۔
کو ایسی تصویروں کا بہت شوق ہے۔ اور خوش قسمتی کیلئے یا بد قسمتی سمجھتے
بھی بہت شوق ہے۔ لیکن آسیہ کو ذرا سا بھی لگاؤ نہیں۔
لیکن آپ کتنی چپ بیٹھی ہیں۔ کوئی تو بات کریں۔ میں اس وقت سے خود ہی
ل رہا ہوں۔

لیکن میں تو گونجی ہو گئی تھی۔ ایک لفظ تک نہیں بولا
رہا تھا۔ پھر وہ بھی خاموش ہو گیا۔
تھوڑی دیر کے بعد آسیہ آگئی۔ اور ساتھ نوکر چائے لے کر آیا۔
اس کا بھائی بھی زبردستی چائے میں شریک ہو گیا۔

کتنی باتیں کرتا تھا اس کا بھائی! کتنا ہنس مکھ اور کتنا خوبصورت سا
ہے۔ اس کی آنکھیں کس قدر چمک دار تھیں۔ اور جسم کتنا اچھا تھا۔
میں وہ اتنی دلچسپی سے کیوں باتیں کر رہا تھا۔

پھر دوبارہ آنے کا کتنا اصرار کر رہا تھا۔ آج آسیہ نے بھی کہا تھا
کہ تمہارے جانے کے بعد میرے بھائی نے تمہاری بہت تعریف کی
ہی۔ کتنا تھا بڑی بھولی اور معصوم اور پیاری سی لڑکی ہے۔ اور میں خواہ
خواہ شرمائی گئی تھی۔

آپ تو خواہ مخواہ گھبرا گئیں۔ واقعی یہ میری زیادتی تھی۔ آپ مت
میں خود چلا جاتا ہوں۔ صرف اس سگریٹ کو ختم کرنے تک یہاں بیٹھوں
شوق سے تصویریں دیکھیں اور اگر آپ کو تصویروں کا شوق ہے۔ تو
لائے دیتا ہوں۔ ادھر الماری میں بہت سی پڑی ہیں۔
آپ خود ہی اٹھ کر نکال لیں۔ یہ آپ کے کچھلی طرف جو الماری ہے۔
نکال لیں وہاں سے۔

ارے! آپ تو خواہ مخواہ اتنا زیادہ شرماء رہی ہیں۔ اس میں بھلا
کی کیا بات ہے! اور پھر آپ کا ہاتھ بھی کس قدر ٹھنڈا ہو رہا ہے۔
اچھا! آپ تو بول ہی نہیں رہیں۔ میں خود ہی نکال دیتا ہوں۔
. یہ سویرنہ لینڈ کی تصویر ہے۔

اور یہ

کھول دیا اور میں بیٹھ گئی۔ بھڑکی دیر گزری تو مجھے اچانک خیال آیا کہ اگر اسکا بھائی آگیا تو اور میرا دل دھڑکنے شروع ہو گیا۔ میں نے سوچا کل اسکول میں کتاب واپس کر دوں گی۔ مجھے چلے ہی جانا چاہیے اور میں اٹھ کر آئے گی۔ سیڑھیاں ملے کر رہی تھی کہ آسیہ بچہ اپنے بھائی کے بازار سے واپس آگئی۔

ہوا زائدہ! تم کب آئیں؟

ابھی ابھی آئی تھی۔۔۔۔۔ بس اب جانے لگی تھی۔ میں نے رک رک کر کہا۔
تو تم کچھ دیر بھی انتظار نہ کر سکیں۔ بس یہی ہماری قدر ہے! آسیہ نے منہ بنا کر کہا۔
نہیں نہیں یہ بات نہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ کہیں زیادہ دیر نہ ہو جائے۔ کل آ جاؤں گی۔
اس کے بعد ہم تینوں اندر کمرے میں جا بیٹھے۔ اور پھر جو باتیں شروع ہوئیں تو گھنٹہ ہو گیا۔ مزیوں کے دن بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو شام پھیل رہی تھی۔ میرا دل بڑا ڈرا کہ دادا جان تو جان ہی نکال دیں گے۔

میں بڑی مشکل سے آسیہ سے رخصت لے کر آئی اور تیز قدم اٹھاتی گھر کی طرف چلنے لگی۔ دادا جان گھر پر نہیں تھے میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

رات کو مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔ آسیہ کا بھائی یاد آتا تھا اس کو سرخ ٹاٹی اچھی لگ رہی تھی۔ اور ناختمائی رنگ گرم سوٹ اسے کتنا سج رہا تھا۔۔۔۔۔ اس کے چہرے پر کس قدر دکھتی ہے!

اور یہی سوچتی ہوئی سو گئی۔

۱۵۔ دسمبر :-

امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہوں۔ نو ماہی امتحان ہو رہے ہیں۔ آسیہ نے کسی بار بلایا ہے۔ مگر میں جا ہی نہیں سکی۔ کل تو آسیہ خفا ہی ہو گئی۔ کہ تم کیوں نہیں آئیں۔ سنجہ کوئی دو مہینے سے اسکول نہیں آ رہی۔ سنجہ میری بہت پیاری دوست ہے۔ کتنی مہربان اور مخلص

مائے! اگر دادا جان کو پتہ چل جائے کہ میں نے ایک مرد کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی ہے۔ تو وہ ابھی بمعہ والدہ اور بہن بھائی کے ہم کوند چھڑی سے ذبح کر دے۔ اور خود پاگل ہو جائے۔ اس کے خیال دنیا میں قیامت آ جائے۔ کیونکہ دادا جان قیامت کی نشانیاں یہی بتلاتے ہیں۔ اور دوزخی ہونے کی بھی۔ جب کوئی لڑکی کسی غیر لڑکے کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرے گی۔ چاہے وہ باتیں قرآن مجید اور نماز کی کیوں نہ ہوں؟ تب قیامت آ جائے گی۔

لیکن قیامت تو کوئی نہیں آئی۔ نہ آئے گی۔ دادا جان کا تو دماغ خراب ہے۔ مائے بیٹھ پر کتنا درد ہو رہا ہے۔ اتنی سینک کرتی رہی تھیں۔ دو تین ایک اسکول نہ جا سکوں گی۔ اچھا میں گھر میں بیٹھ کر کام کروں گی۔
دیکھیں دادا جان کیا قیامت کھڑی کرتے ہیں۔

اب تو امی بھی کہتی ہیں کہ اسکول جانا چھوڑ دے۔ کیا فائدہ! تجھے یہ کر دے گا۔

مائے امی! یوں نہ کہو۔۔۔۔۔ میں پڑھنا کبھی نہ چھوڑوں گی کے لیے اپنی بیٹی کا دل نہ ٹوڑو۔ یہ دادا تو پاگل ہے۔

۲۹ نومبر :-

آج کئی روز کے بعد اسکول گئی۔ اس انگلیں ہو کر دل پریشان سا رہتا ہے۔ جان جانے نہیں دیتے تھے۔ بڑی مشکل سے ان کی خوشامدی اور منتیں کر کے گئی تھی کہ جماعت کو پاس کر لوں۔ یہ آخری جماعت ہے۔ پھر دسویں پاس کر لوں گی۔ پھر آگے بیٹھوں گی۔۔۔۔۔ تب کہیں جا کر وہ ملنے۔ آسیہ اسکول نہیں آئی تھی۔ میں نے کتاب کرنی تھی۔ چھٹی کے بعد اس کے گھر گئی تو پتہ چلا کہ وہ شاپنگ کے لیے بازار گئی ہوئی۔ بس اب آنے ہی دالی ہوگی۔ مجھے بیٹھ کر اس کا انتظار کر لینا چاہیے۔ لو کرنے پچھلے کمرے

ہیں۔ چوٹیاں ہیں۔ ٹھنڈی ہوائیں ہیں۔ کہ تم دیکھو، تو پاگل ہو جاؤ۔
مجھے سیر سیاحت کا بہت شوق ہے۔ اور میں ساری دنیا کا چکر لگانا چاہتا ہوں۔ پچھلے سال
میں انگلینڈ چھ ماہ رہ کر آیا ہوں۔

تمہیں وہاں کی باتیں کیا بتاؤں! کس قدر آزاد اور خوشحال اور خوبصورت ملک
ہیں ہم لوگ تو ان کے مقابلے میں صفر کے برابر بھی نہیں ہیں۔ وہاں عورتیں آزاد پھرتی ہیں۔ ان
کی صحبتیں اس قدر اچھی ہیں کہ گلاب کے پھول معلوم ہوتی ہیں مگر اور پھر جھجک
کہ وہ کہنے لگا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے تم سے زیادہ بھولی اور شیریں نہیں ہیں۔

اچھا دیکھو زائدہ! ایک بات کہوں۔ برا تو نہ مانو گی۔ لیکن اگر تم بڑا بھی مناؤ گی تو بھی کہے
بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں تم کو بہت پیار کرنے لگا ہوں۔ اور زائدہ! تم مجھے بہت یاد آنے لگی ہو۔
جس دن سے تمہیں دیکھا ہے بہت اداس رہنے لگا ہوں۔

کیا تم اس گھر میں رہنا پسند کرو گی

کیا تم آسیہ کی بھابی بنو گی!!

کیا تم میری بنو گی!!!

میں ایسی محبت نہیں چاہتا۔ جو صرف محبت ہو۔ بلکہ میں تو تم سے شادی کر کے اپنی بیوی
بنا کر گھر لانا چاہتا ہوں۔ اور ساری عمر اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔

لولو! کیا تم میری بیوی بنو گی!

مائے! میں اس کی باتوں کا بھلا کیا جواب دیتی۔ میں شرم سے دوسری ہوئی جا رہی تھی
مجھ سے تو آنکھ نمک نہیں اٹھائی جاتی تھی۔ لولو! تو الگ رہا۔

آسیہ کا خوبصورت۔ نوجوان اور دلکش چہرے والا بھائی۔ اختر میرے سامنے بیٹھا
تھا۔ اور مجھے تنکے جا رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے نظر اٹھا کر دیکھا۔ تودہ پرنسوں نظیر
مجھ پر گڑھی ہوئی تھیں۔ میں سر سے لے کر پاؤں تک لرز گئی میرا دل تیزی سے
دھڑکنے شروع ہو گیا۔

دہ لولا بتاؤ زائدہ! کچھ تو لولو کیا تم مجھے پسند نہیں کرتیں۔

لڑکی ہے۔ دسویں کلاس کے بعد مجھ سے جدا ہو جائے گی۔ اس کے آبا جان کی تبدیلی کو لمبو ہو
گئی ہے۔ یہ وہاں چلی جائے گی پھر نہ جانے کب آئے گی۔
آسیہ اور قسم کی لڑکی ہے۔ اس سے میری طبیعت نہیں ملتی۔ مگر بچہ تو بڑی اچھی لڑکی
ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ وہ مجھے برابر خط لکھے گی۔ ننھے انجم کو بھی بچہ
کس قدر پیار کرتی ہے! میرا ننھا بیٹا انجم اس ہو جائے گا۔ اور نسیم بھی۔
کاش! میں بھی بچہ کے ساتھ کولمبو جاسکتی۔ سیلون کس قدر خوبصورت شہر ہو گا! وہاں
ناریل کے درخت ہیں۔ تیز بارشیں ہیں۔ کنول کے پھول ہیں۔ جھیلیں ہیں۔ مندریں
آسیہ کے بھائی نے بتایا تھا کہ سیلون میں سڑک پر گندگی کے ڈھیر کی جگہ بھی پھولوں کے ڈھیر
ہوتے ہیں مائے! وہ شہر کس قدر خوبصورت ہو گا۔

۲۶ - دسمبر :-

آسیہ دسمبر کی چھٹیوں میں کراچی سیر کے لیے گئی ہوئی ہے۔ مجھے اس نے بتایا ہی نہیں
میں اس کے ماں گئی۔ تو پتہ چلا کہ سارے چلے گئے ہیں۔ اس کا بھائی عمر پر موجود تھا۔ میں نے والدین
آنا چاہا تو اس نے ہٹھرایا میں گھبرا گئی۔ میں ہٹھرا نہیں چاہتی تھی۔ اکیلے گھر میں۔ اگرچہ
بھی تھے۔ مگر پھر بھی مجھے ڈر تھا کہ آسیہ کیا کہے گی؟

لیکن اس نے زبردستی بٹھالیا۔ نوکر کو چلے لانے کو کہہ دیا۔ میں بہت برا منع کرتی رہی۔ مگر
نہ مانا پھر اس نے مجھے کشمیر کی تصویریں دکھائیں۔ کشمیر اور کلو کی چراگاہیں۔ وہاں کے
نظارے اور بتایا کہ ساری تصویریں میں نے خود کشمیر سے لے کر رنگ بھرے ہیں
میں نے کشمیر کا کو نہ کو نہ دیکھا ہوا ہے۔ وہاں اتنے خوبصورت پہاڑ ہیں۔ پھول ہیں۔ درخت

لیکن میں خاموش رہی۔ میں اسے کیا بتاتی! میں اسے کیا جواب دیتی!

بھلا دھرتی کے باسی پھول اور آسمان کے چمکتے ہوئے ستارے کا بھی کبھی ساتھ ہوا ہے۔ بھلا مغل اور مل کا بھی کبھی میل ہوا ہے! کہاں مخلوق میں رہنے والا اختر... اور کہاں جھونپڑی میں رہنے والی زاہدہ! کشادہ باغوں اور تنگ گلیوں کا کیا میل! میرا دل لکڑی اس کی محبت سے بھرا ہوا! اپنی غریبی پر بھرا ہوا۔ اس آغاز کے انجام پر رونے لگا۔۔۔۔۔ اور آخر میں دادا جان کا چہرہ یاد آتے ہی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور یہ رونا اس وقت اور تیز ہو گیا جب مجھے کیم افیونی اور بھنگی کا خیال آیا۔ جن کے ساتھ میرا دادا مجھے باندھنا چاہتا تھا آخر میرے رونے پر حیران رہ گیا۔ اس نے سمجھا کہ شاید اس کی باتیں مجھے بُری لگی ہیں۔ بے چارہ گھبرا گیا۔ کہنے لگا۔

زاہدہ! خدا کے لیے مت روؤ! مجھے بتاؤ رونے کی وجہ کیا ہے؟ کیا میری کسی بات پر نہیں رونا آیا ہے! میری باتیں تمہیں بُری لگی ہیں!۔۔۔۔۔ کیا تم اس رشتہ کو پسند نہیں کرتیں اگر تم نہ چاہو گی تو میں زبردستی نہیں کروں گا۔ مگر خدا کے لیے روؤ نہیں۔ دیکھو ابھی نوکر چائے لے کر آجائے گا۔ تودہ دیکھے گا تو کیا کہے گا۔۔۔۔۔ چپ ہو جاؤ۔۔۔۔۔ یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اسے چوم لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ میں نے جلدی سے ہاتھ چھڑایا اور پھر بغیر بات کیے چلے پیٹے گھر آ گئی۔ اس نے کتنا زیادہ اصرار کیا۔ مگر میں نہ بھڑکی ہائے! میں کتنی پاگل ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب ہی نہ دیا کیا پتہ میری قسمت کتنی اچھی ہی ہو۔ اگر میری شادی وہاں ہو جائے تو!۔۔۔۔۔ سب ہمسایوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔ میری سہیلیاں حیران رہ جائیں۔ میری والدہ کے چہرے پر پھیلی ہوئی کتنی ہی جھڑپاں ٹھیک ہو جائیں۔ ہائے اللہ! ہمارے کہتے دن نہ پھر جائیں! میرا چھوٹا بھائی اور بہن ایسا بھائی پا کر کس قدر خوش نہ ہوں لیکن ہمارا گھر تو کس قدر چھوٹا سا ہے۔ کیا وہ یہاں آجایا کر سہے گا! کیا اس کے گھر والے مان جائیں گے۔

نہیں وہ نہیں مانیں گے۔ وہ کیسے مانیں گے کہ انکا اکھوتا میٹا اور بھائی ایک غریب لڑکی سے شادی کر لے!۔۔۔۔۔ کبھی نہیں مانیں گے۔

میں بھی بھلا کتنی پاگل ہوں۔ جو ایک دم سوچنے پر انڑ آئی ہوں کیا معلوم اس نے مذاق

لیا ہوا۔۔۔۔۔
میں تو سچ بچ لگی ہوں۔

اب میں ایسا کبھی نہ سوچوں گی۔ میں اس کے گھر ہی نہیں باؤنگی کبھی نہیں جاؤں گی۔ کہیں دادا کو پتہ چل گیا تو وہ گلہ ہی دبا دیں گے۔

یا خدا! میری مدد کرنا۔ مجھے وہاں جانے سے روکنا! آمین ثم آمین! اے میری نیند! تو اب دن سے میرے پاس آجا۔ میں اب سونے جا رہی ہوں۔ اتنی کہہ رہی ہیں کہ اتنی رات گئے تک ٹی کے دیئے تلے بیٹھ کر اسکول کا کام مدت کرنا نکھیں خراب ہو جائیں گی ان کو کیا پتہ کہ آنکھوں کے ہاتھ ہاں دل بھی خراب ہو رہا ہے۔

یا خدا! میری مدد کرنا۔ مجھے بُری راہ سے بچانا۔ میری سہیلیاں کہتی ہیں۔ کہ مرد بے دنا ہوتے ہیں۔ لڑکوں کو خراب کر کے چھوڑ جاتے ہیں۔ بدنام کر دیتے ہیں۔ یا خدا! مجھے ان سے پانا۔ ضرور بچاؤ آمین۔

پیاری زادہ!

تمہیں بہت بہت پیار!

تم اس دن سے برا برباد آرہی ہو۔ میں روزانہ گھر پر تہارا انتظار کرتا رہا ہوں۔ مگر تم نہیں آتی۔ اگر تمہیں میری اس دن کی باتوں کا بڑا لگا ہو۔ تو مجھے معاف کر دو۔ لیکن میں کیا کر دوں! میں دل کے ماتحتوں مجبور ہوں۔ ادرا ب بھی تمہیں دہی باتیں دہرا کر تم سے جواب مانگتا ہوں۔ امید ہے تم ضرور جواب دو گی۔

کیا تم آج اسکول کے بعد آؤ گی!

میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں گا۔ فقط

صرف تمہارا

اختر

خط پڑھ کر میں نے جلدی سے بھاڑ دیا۔ اور ٹکڑے وہیں پھینک کر آگئی۔ باہر نکلی تو یوں لگا اندر داخل ہوتے وقت جو مال گاڑی سر پر کھڑی تھی۔ وہ اب گزر چکی ہے اور میں بھی ہو کر نیچے آگئی ہوں۔

میں خاموشی سے سیڑھیاں طے کر کے نیچے آگئی۔ مجھے ایک دم یوں محسوس ہوا تھا جیسے اختر اور آسیہ مل کر مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ بھلا اختر کو مجھ سے ایسی کونسی محبت ہو سکتی ہے۔ لیکن میں بے وقوف نہیں بنوں گی۔ . . . میں کبھی نہیں جاؤں گی ساری چٹھی کے وقت آسیہ نے مجھ سے پوچھا۔ زادہ آج ہمارے گھر آؤ گی۔

نہیں میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔ میں نہ آسکوں گی۔! اور وہ چلی گئی۔ میں اپنے گھر آئی اور اس اور خاموش سی ہو کر اپنی کھڑکی میں بیٹھ گئی۔ سامنے کے مکان میں ایک لڑکا اظہر رہتا ہے اس کی نئی شادی ہوئی ہے۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ادھر دھوپ میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور بیوی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی ہے اور وہ محبت اور پیار سے بھری ہوئی نظروں سے اسے ٹیک رہا ہے۔ اور وہ مسکرا رہی ہے۔

مجھے ایک دم یوں لگا جیسے اظہر کی جگہ اختر ہے اور اس کی بیوی کی جگہ میں ہوں۔ اور دنیا

۲۔ جنوری

آج سے اسکول کھل گیا ہے۔ صبح سویرے اسکول گئی۔ دعا ہوئی۔ دعا کے بارے میں آگئی۔ آسیہ ملی۔ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میرا دل ایک دم دھڑکنے لگا۔ میں اکھس نیچ کر لیں جیسے چوری کرتے پکڑے گئی ہوں۔ وہ سننے لگی۔ اور پھر مجھے ایک جاکر ایک رقعہ دیا۔ کہ یہ لو، اسے آدھی چٹھی کے وقت پڑھ لینا! ابھی ڈسک میں بند کر لو۔ میں نے بغیر جواب دیئے جلدی سے لے لیا۔ اور ڈسک میں بند کر لیا۔ کیس لڑکی لیں۔ . . .

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پہلے ہی اس چیز کی منتظر تھی۔ آدھی چٹھی کے وقت کی ہمت نہ ہوئی لیکن سارا وقت بے چین سی رہی۔ بار بار تالے کو دیکھتی رہی کبھی کیا لکھا ہے! کیا لکھا ہوگا؟ پتہ نہیں کیا ہوگا؟ کہاں جاکر دیکھوں؟ اچھا لیٹرین میں جاکر دیکھتی ہوں اور پھر میں ادھر چلی آئی۔ اور لیٹرین میں جاکر خط پڑھا! لکھا تھا:-

پہلی دفعہ کچھ سمجھ نہ آئی۔ دوسری بار پھر پڑھا۔

بڑی خوبصورت جگہ ہے۔ جہاں قدم قدم پر ایسا پیار کرنے والے خاوند کی مسکراہٹ اور
پر محبت نظر میں میسر ہیں۔ مگر داد اجان کی آواز نے میری تصویر کو دھندلا کر دیا اور میں انہ
پاس جا پہنچی۔

کیا بات ہے داد اجان!

بیٹی! ذرا میرے حقے میں دو کوئٹے تو چوہلے سے لا ڈال! اور دیکھ! ادھر طاق پڑا
کی پڑیا پڑی ہے اسے بھی لیتی آ، اور دیکھ! السیمہ اور انجم باہر کھلی میں نکلے تھے۔ آدھ گھنٹہ
گیا ہے۔ ابھی تک واپس نہیں آئے۔ ان کو ذرا آواز دے۔
میں نے خاموشی سے سارے کام کر دیئے۔ اور پھر کھڑکی کے پاس آ بیٹھی۔ مگر
دردنوں نیچے چلے گئے تھے، اور مجھ یوں لگا جیسے وہ نیچے نہیں گئے بلکہ آسیہ کے گھر
ہیں۔

۲۶۔ جنوری :-

کئی روز سے اداس اور خاموش ہوں۔ آسیہ سے کتراتے ہوں۔ حالانکہ اُس
گھر آنے کے لیے کئی بار کہا ہے۔ مگر میں نہیں جاؤں گی۔ میں کیوں جاؤں!!
میری زندگی ایک ایسا اداس گیت ہے۔ جیسے امتحانوں میں ایک ماہرہ
ہے۔ اب مجھے پورے دھیان سے پڑھنا چاہیئے۔ پہلی مارش کو امتحان شروع ہو رہا ہے
خدا کرے۔۔۔ میں میٹرک میں وظیفہ لے لوں۔ اس کے بعد میں ایف اے
کروں گی۔ پھر بی۔ اے۔ اور پھر ایم۔ اے اور پھر انجینیئرنگ چلی جاؤں گی۔۔۔
مائے! کتنا اچھا ہو جو ایسا ہو جائے!
کاش ایسا ہو جائے! آمین۔

۴۔ فروری :-

آج آسیہ نے بتایا کہ اس نے ایسے گیس پیپرز منگوائے ہیں جس میں سے پورے کے
رے سوال آجائیں گے۔ اور وہ کہنے لگی کہ وہ مجھے بھی ضرور دے گی۔
آسیہ کتنی اچھی لڑکی ہے۔ اس نے کلاس میں کسی اور لڑکی کو نہیں بتایا۔ صرف مجھے
ایا ہے۔ میں خواہ مخواہ اس سے کھینچی کھینچی رہتی تھی۔
اس کے بھائی نے بڑی مشکل سے یونیورسٹی کے کسی شخص سے حاصل کئے ہیں۔
اب وہ مجھے ضرور دے گی۔ وہ سکول نہیں لاسکتی ناکہ بونکہ اگر یہ بات QUI ہو گئی
تو پھر اس شخص کے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔ اور پھر پرے سے مرے
بھوانے پڑیں گے۔
میں کل لینے کے لیے اس کے گھر جاؤں گی۔ آج میرے کپڑے کچھ اچھے نہیں
۔ کل جاؤں گی۔

۵۔ فروری :-

آج میں آسیہ کے ہاں گئی۔ اس کا بھائی کبیل اور اڑھے پلنگ پر سو یا ہوا تھا۔ ہم
رے کمرہ میں چلی گئیں۔ آسیہ کہنے لگی۔ پم پم بھتیکی الماری میں ہیں۔ ابھی اٹھیں گے تو میں
اس کے بعد ہم اور باتیں کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اختر اٹھا۔ انہیں نیند سے
لاہور ہی تھیں۔ چہرے پر عجیب طرح کا سحر تھا۔ مجھے دیکھا تو بے حد خوش ہوا۔ اور چل کر
انا تھ پکڑ کر چوم لیا۔ اور پھر زور سے ہاتھ دبا لیا۔ میں شرم سے پاگل سی ہو گئی۔
کتنا پاگل ہے اس کا بھائی۔ آسیہ کے سامنے ایسی حرکت کر دی۔ اور پھر ایسی حرکت کیا۔

میں واقعی تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

پھر آپ اگر میرے ساتھ مذاق نہیں کر رہے۔ تو اپنے ساتھ کر رہے ہیں۔
میں اپنے ساتھ مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ اپنے ساتھ خوشی کی بات کر رہا ہوں۔

زاہدہ! مجھے تمہاری قسم۔ جو میں جھوٹ بولوں۔ کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اور
سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

کیوں نہیں ہو سکتا زاہدہ!

ہم غریب لوگ اور آپ امیر لوگ۔ ہمارا اور آپ کا کیا رشتہ!

تم امیری غریبی کی بات نہ کرو۔ میں ایسی ہر بات سے آزاد ہوں۔ میں جس سے شادی
اچاہوں۔ اس سے شادی کرنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔

تمہارے گھر والے کبھی نہ مانیں گے۔

اگر وہ میری بات نہ مانیں گے تو کس کی مانیں گے۔

وہ اپنے فقار اور عزت کی بات مانیں گے۔

میرا نام ہی ان کا فقار اور عزت ہے۔ زاہدہ! تمہیں اس سے کیا تم ایک دفعہ ہاں
اپنے دل کی بات بتا دو۔ پھر میں جانوں اور میرا کام۔ تمہیں اس سے کیا؟

اور میں خاموش ہو گئی۔ میں اور کیا کہتی! بھلا جسے اختر حبیب اچھا اور چاہنے والا خاوند
بائے۔ اسے کیا چاہیے!

میری خاموشی پر وہ کہنے لگا

تو کیا میں تمہاری خاموشی کو ہاں سمجھ لوں۔

اور میں نے سر جھکا دیا۔

بس جی! اس کی تو باجھیں کھل گئیں۔ اور اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وعدہ کیا

زندگی بھر میرا ساتھ دے گا۔ ہر حال میں ساتھ دے گا۔ سارے گھر والوں کو، خاندان

بڑے گا مگر مجھے نہ چھوڑے گا۔ اور یہ کہہ کر اس نے میرے ہاتھ کو کئی بار چومنا۔ اور

کی کیوں؟ مجھے برا سا لگا۔ مجھے ڈر سا لگا۔ میں پریشان سی ہو گئی۔ میرا دل
لگا۔

اور میں ہاتھ چھڑا کر دیوار کے ساتھ لگ کر خاموش کھڑی ہو گئی۔ میرے سر
کلاک ٹیک ٹیک کر رہا تھا اور کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا اندر داخل ہو رہی تھی۔ اور آسیر
بنی الماری میں سے پرچے ڈھونڈ رہی تھی۔ اختر نے کہا۔

پرچے تو ادھر والے کمرہ میں پٹنگ کے ساتھ والی میز پر پڑے ہیں اور وہ
چلی گئی۔

اختر نے مجھے پکڑ کر پٹنگ پر بٹھا لینا چاہا۔ مگر میں نے سختی سے کہا آپ نے
کرفی ہو۔ منہ سے کریں۔ مجھے ہاتھ مت لگائیں۔

کیوں! کیا میرے ہاتھ ایسے ہی گندے اور بڑے ہیں! اگر یہ برے ہیں تو لوہ
کاٹ لیتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ دانتوں تلے زور سے دبایا۔ اور پھر
دانت اندر کو دھسنے لگے۔ پھر کہنے لگا:

اچھی زاہدہ! دیکھو! یہاں کرسی پر آن کر بیٹھ جاؤ۔ یہاں کھڑا ہونا کس قدر
ہے تم بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جانے میں بھلا کیا سرج ہے! تم نے آج تک کبھی میری بات

لو بھٹو یہاں اور میں خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ میرے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا
تکینے لگا۔ اس کی آنکھوں میں وہی سحر اور التجا تیرنے لگی۔

اس نے پھر وہی کہا۔ زاہدہ! کیا تم مجھ سے نفرت کرتی ہو۔

کیا تم مجھ سے شادی نہیں کرو گی؟

میں نے اس آواز میں کہا۔

”نہیں“

کیوں!

یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ آپ خواہ مخواہ میرا مذاق نہ بنائیں۔

خدا کی قسم۔ میں تمہارا مذاق نہیں بنا رہا یقیناً کرو۔ میں تمہیں دل و جان سے

پھر میں آسیہ سے ملے بغیر گھر آگئی۔
میرادل خوشی کے مارے اچھل رہا تھا۔ میراجی چاہتا تھا گھر میں داخل ہوتے

بھاگ کر والدہ کے سینے سے چپٹ جاؤں۔ اور اسے تباؤں۔ سارا کچھ تباہیوں۔ میراجی
طے کرتے ہی تھی نسیہ ملی میں نے اسے گود میں اٹھالیا اور بہت پیار کیا۔ میں بے حد خوش
میراجی ہر خوشی سے کھل رہا تھا۔ میں نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا تو سرخ ہو رہا تھا۔
آج والدہ کہہ رہی تھیں کہ تو اتنی خوش کیوں ہے؟ آج میں والدہ کو بہت دیر تک
رہی۔ ان کے مطلب کی باتیں کیں۔ ان کی ماں میں ہاں ملاتی رہی اور جو کام وہ کہتی پڑ
کرتی رہی۔

لیکن اُمی دیکھو تو آسمان پر کتنے خوبصورت بادل چھائے ہوئے ہیں۔ ہوا کتنی پیاری
پل رہی ہے۔ اُمی! آج تو سونے کا دن ہے۔
پاگل میٹی! بس بادلوں اور ہوا اور پھولوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہتی ہے۔
چل اٹھ! اب لیٹر کو چھوڑ دے چل میری میٹی! اور میں اٹھ بیٹھی!
اور جلدی سے تیار ہو کر اسکول چل دی۔ وہاں پر آسیہ ملی۔ اور اس نے مجھے گلے لگے۔ یہ بچہ
ہوں! کیا اسے علم ہو گیا ہے! میرادل دھڑکا۔ اور اس نے ہولے سے میرے کان میں جھنجھکی
ہنا۔ اور میں سرخ شفق بن گئی۔
تو تم بھی مجھے بنانے لگ پڑی ہو۔
میں بھلا کیوں بنانے لگی! اور پھر میں نے کیا بھی کیا ہے؟ تمہیں تو خواہ مخواہ شک ہو گیا

ہے۔

کا ہے کاشک؟

اچھا بناؤ۔ پر پے لائی ہو؟

اونہوں!

تو پھر کیسے ددگی؟

گھر آن کر لے جانا۔

میں نہیں روز روز گھر آتی۔

اب تو روز روز آنا پڑے گا۔

اُمی کو آن کر پھر تم ہی منانا۔

ماں میں ان کو کہہ دوں گی۔

اور دادا جان کو!

ان کو خدا بتا دے گا!

خدا کیا اسکول میں پڑھتا ہے؟ اور کب آکر کہے گا؟

آج سے دو سال کے بعد خدا آن کر کہے گا۔ تب تیرا دادا خود تجھے دلہن بنا کر ہمارے

۶۔ ضروری :-

ساری رات میں بائیکل نہیں سو سکی۔ ساری رات میرے خوابوں میں اختر چھا
کبھی ہم دونوں نیلگوں پہاڑیوں کو عبور کر رہے ہیں۔ کبھی ہم وادیوں اور گھاٹیوں کو طے کر رہے
ہم دونوں نے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہیں۔ اور تھوم رہے ہیں۔ میں نے بے حد خوبصورت
کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور اختر مجھے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا ہے۔

رات بار بار نیند ٹوٹ جاتی تھی۔ آج کا صبح بڑے ہی عجیب انداز سے طلوع ہوا
آج سورج نے بڑی شان سے آنکھیں کھولیں۔ آج کی صبح کس قدر خوبصورت
آسمان پر بادلوں کے خوبصورت جزیرے بنے ہوئے تھے۔ نیلا آسمان اور بھٹکا
ہوا۔ میری آنکھیں۔ اپنے آپ بند ہونے لگیں۔

اُمی نے آن کر اٹھالیا۔ میٹی! کیا آج نماز نہ پڑھو گی! جلدی اٹھو۔ اسکول سے دیر ہو

گھر رخصت کرے گا۔ سمجھیں !

اور دعا کے یگھٹنی ہوئی۔ اور دعا کے وقت میں نے سر جھکا کر خدا سے عاجزی سے دعا مانگی۔ کہ یا خدا میری مدد کرنا۔ مجھے بدنامی سے بچانا اور میرا ساتھ دینا۔ اور دعا مانگتے وقت میرا دل بھر آیا۔ اور دعا ختم ہونے کے بعد جب میں کلاس روم پہنچا، تو میرے قدم مست تھے اور دل اداس۔

۱۵ فروری :-

آج ہمارے اسکول میں ہماری FAREWELL پارٹی تھی۔ کیونکہ پہلی مارچ امتحان شروع ہو رہے ہیں۔ اور امتحان کی تیاری کے لیے پندرہ چھٹیاں ہوتی ہیں۔ کل آسیہ ہمارے گھر آئی تھی۔ اور اس نے میری والدہ اور دادا جان کو منایا ہے کہ وہ ان چھٹیوں میں ہمارے گھر پڑھنے آیا کرے گی۔ آسیہ کو اپنا گھر دکھاتے ہوئے میرا چہرہ اداس تھا۔ ان کا گھر کس قدر خوبصورت ہے مگر ہمارا گھر ایسا نہیں ہے۔ کہیں آسیہ گھر جا کر آخر کو نہ تباہ سے۔ آخر بھلا یہاں کیسے آیا کرے گا؟

اس سوچ نے مجھے اداس اور آرزوہ کر دیا۔ اور میں سارا دن اداس رہی۔ خاموشی سے اسکول کو الوداع کہا۔ الوداع کہتے وقت میرا دل بھر آیا۔ مگر میری آنکھیں خا رہیں۔

آسیہ کے ہاں روزانہ جاتی ہوں۔ وہاں پر اتنا جی مگ گیا ہے کہ بڑی مشکل سے گزرتی ہوں۔ اور صبح کو پھر چل دیتی ہوں۔ آسیہ بھی دادا جان پر نہ جلتے کیسا جادو پھونک رہے کہ وہ کچھ نہیں کہتے۔ آسیہ کی اتنی کس قدر اچھی ہے ! اور آخر کس طرح سارا سارا دن تنگ کرتا رہتا ہے ؟ ذرا آسیہ ادھر ادھر ہوئی۔ اس نے آن کر باتیں کرنا شروع کر دیں اور ہاتھ چومنے لگتا ہے۔ بے چین سا ہو جاتا ہے۔ باتیں کرتا ہے کہ شادی کے بعد یہ کریں گے وہ کریں گے۔

زندگی کتنی دلچسپ اور کتنی پیاری چیز ہے۔ پہلے میں کتنی اداس کرتی تھی۔ اداس تو میں اب بھی کبھی کبھی ہو جاتی ہوں۔ لیکن اس اداسی کا کیا ہے ! امتحان سر آگیا ہے ! پرسوں سے امتحان شروع ہو رہا ہے۔ خدا کرے میں اچھے نمبروں پر پاس ہو جاؤں۔ اب تو پڑھائی میں وہ جی نہیں لگتا جو پہلے لگتا تھا۔

۱۶ مارچ :-

آج جغرافیہ کا پرچہ تھا۔ جو بہت اچھا ہو گیا ہے۔ آسیہ کا بھی اچھا ہو گیا ہے۔ آخر نے بہت بہت مبارک دی ہے۔

۱۶ مارچ :-

پرچے بہت اچھے ہو رہے ہیں۔ ڈائری لکھنے کی فرصت نہیں مل رہی۔ امید ہے۔ باقی کے پرچے اچھے ہو گئے تو فرسٹ ڈویژن آجائے گی۔ خدا کرے۔ ایسا ہی ہو !

پھر آخر کس قدر خوش ہو گا !

آسیہ نے کہا۔ وہ بہت پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ اور ہم آگے آگے آرہی تھیں۔ اسی زینب بھی ساتھ تھی۔ وہ پرلی گلی کی طرف مڑ گئی ہے۔

اچھا۔۔۔۔

آسیہ چلا گئی۔ مجھے ڈر تھا۔ بعد میں دادا جان کچھ نہ کہیں۔ مگر وہ خاموش رہے۔ اور کچھ دیر کے بعد بولے۔

زائدہ بیٹی! وہاں مت جایا کر۔ جن کے گھر جوان بھائی ہوں۔ وہاں نہیں جانا چاہیئے۔ اگر تو اب گئی۔ تو یاد رکھ میں تجھے بہت بُری طرح ماروں گا۔

میں نے وعدہ کر لیا۔۔۔۔۔ دادا جان! اب کبھی نہ جاؤں گی۔۔۔۔۔ اور یوں وہ خاموش ہو گئے۔

کیا مجھے وہاں نہیں جانا چاہیئے۔ ہاں واقعی نہیں جانا چاہیئے۔ کیونکہ پھر بعد میں جب میری شادی وہاں ہوگی۔ تو وہ کہیں کچھ ایسی ایسی بات ہی نہ سمجھ لیں۔ اور شادی کرنے سے انکار کر دیں۔

ایسا کبھی نہیں ہونا چاہیئے۔ آخر سے تو اب میری ساری زندگی وابستہ ہے۔ اب میں ہمیشہ کے لیے اسی کی اور صرف اسی کی ہوں۔

۱۶۔ مارچ :-
آج آخری پرچہ تھا۔ آج اتنی سے اجازت لے کر زندگی میں پہلی بار۔۔۔۔ میں آسیہ فلم دیکھنے گئے۔ درمیان میں اختر تھا۔ ایک طرف میں تھی۔ اور دوسری طرف آسیہ ”سہاگ رات“ فلم دیکھی۔ فلم مجھے بے حد پسند آئی اور خاص طور پر گیتا بالی کا کیریکٹر اور آسیہ کو یہ فلم پسند نہ آئی۔

رات کو آسیہ مجھے گھر چھوڑنے آئی اور دادا جان سے یہ کہا کہ ان کے گھر میلاد تھا۔ اس لیے دیر ہو گئی۔

دادا جان نے کہا۔ کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں میلاد شریف میں بیٹھنا تو کاکام ہے۔ لیکن بیٹی! کاہے کے لئے میلاد شریف کر دیا تھا۔

اتنی نے کہا۔ کوئی کاہے کے لئے میلاد شریف کرتا ہے۔ اللہ کا نام کوئی کسی کے لئے لیتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔

میرا مطلب۔۔۔۔۔ اچھا میلاد شریف کر لیا تھا۔ بیٹھو بیٹی آسیہ اب کچھ

۔۔۔۔۔

نہیں میں اب جاتی ہوں۔

تو کیا اب کیلئے جاؤ گی!!

نہیں۔ میرا بھائی ساتھ ہے۔

تو اسے بھی اوپر لے آؤ۔

میرا بڑا بھائی ساتھ ہے۔

تو کیا زائدہ بھی اس کے ساتھ ہی آئی ہے۔

میں ڈر گئی۔

کب کے ختم ہو چکے ہیں! سکول بند ہو چکا ہے۔ سارا سارا وقت گھر پر آتی ساتھ کام کر داتی رہتی ہوں۔ آسیہ نے کئی بار بلا بھیجا ہے۔ مگر نہیں جاسکتی۔ دادا جان جانے کا نہیں دیتے۔ موسم بدل رہا ہے۔ دھوپ میں کچھ تمازت سی آچلی ہے جس سے دھوپ بیٹھنا مشکل ہو رہا ہے۔ چھاؤں میں بھی نہیں بیٹھتا جاتا۔ بالکل ایسے جیسے نہ اس گھر میں رہنے چاہتا ہے۔ اور نہ آسیہ کے ہاں جاسکتی ہوں۔

دادا جان کتنے عجیب ہیں۔ کیا بھلا ان کی یہ بندش میرے دل سے اختر کا خیال نکال سکتی ہے! کبھی نہیں۔ کبھی بھی نہیں نکال سکتی۔

پھر کیا ہوا۔ اگر میں اختر سے نہیں مل رہی۔ اسے ملے کئی روز ہو گئے ہیں۔ مگر میں! روزانہ یاد کرتی ہوں۔ اور جلد سے دعا کرتی ہوں کہ وہ دن جلد آئے۔ جب وہ مجھے پناہ اپنے گھر لے جائے۔ آمین۔ یا خدا میری اس آرزو کو ضرور پورا کرنا۔ اس کے بعد میں اس کے ساتھ نئے نئے ملک دیکھوں گی اور ساری دنیا کا سفر کروں گی اور اپنے بہن بھائیوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کی۔ پھر بہت کچھ ہوگا۔

۴۔ اپریل

آج آسیہ ہمارے گھر آئی تھی وہ چھٹیوں گزارنے کے لیے اپنے انکل کے پاس کراچی بارہی ہے۔ آسیہ میری اتنی سے بار بار کہتی رہی کہ زادہ کو بھی ساتھ بھیج دو۔ مگر اتنی پیاری کیا نہیں لگا ماں ہو کر بھی مجھ پر کوئی اختیار نہیں ہے جو اختیار ہے وہ صرف دادا جان کا۔ اتنی کی قسمت مالک بھی دادا ہے۔ میری، میرے چھوٹے بہن بھائیوں کی۔ اور اپنی محبت کا بھی۔ ہم کو بلا کیا اختیار ہے!

اچھی سہیلی آسیہ! تو خوش قسمت ہے۔ تو امیر گھرانے میں، پڑھے لکھے گھرانے میں پیدا ہوئی ہے۔ تیری قسمت بہت اچھی ہے۔ تو دنیا میں پھولوں کی طرح زندگی گزارنے کو آئی ہوئی ہے اور ہم لوگ تو صرف رونے اور جلنے کو یہاں آئے ہیں۔ ہمیں کراچی سے کیا! ہمیں تو اپنے باشرع لاہور سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ ہمیں تو اس گلی کے باہر، بلکہ اس مکان کے باہر کی دنیا سے لاکوئی واسطہ نہیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو اس گھر پر بھی کوئی اختیار نہیں ہے۔ اور تو کراچی کا مکہ رہی جیسے یہ بھی مکان کی اوپر والی یا نیچے والی منزل پر جانا ہے۔ ہم تو اوپر اور نیچے والی منزلوں

میں بھی دادا جان سے پوچھے بغیر نہیں جاسکتے۔ نہ صرف دادا جان سے پوچھنا پڑتا ہے بلکہ ایسے کئی ارد گرد دادا جان موجود ہیں۔ جن کا خیال کرنا پڑتا ہے۔

تو کراچی شوق سے چلی جا۔ مگر تیری بد نصیب سہیلی کیں نہ جاسکے گی۔ تو کراچی جاسے گی گاڑی میں بیٹھ کر عجیب اور انوکھے راستے اور موڑ دیکھے گی۔ کراچی پہنچ کر سمندر دیکھے گا اور میں نہ دیکھ سکوں گی۔

اسے زاہدہ! جب تو کراچی جائے گی تو وہاں کی بواؤں اور سمندر کو میرا سلام کہنا۔ سمندر میری ماں کی گود ہے۔ جس میں سو جانا چاہتی ہوں۔ امن اور سکون سے سو جانا چاہتی ہوں۔ کاش! میں سنہری پھلی سمندر میں سینے نیچے پانیوں میں تیرتی پھرتی!

آسیب! تو خواہ مخواہ اصرار کر رہی ہے۔ مجھے بھلا کس نے جانے دینا ہے۔ آسیبہ نے بہت کہا۔ مگر توبہ کر دجی جو کہیں دادا جان اجازت دے دیتے۔

پھر آسیبہ نے اتنی اجازت لے دی کہ میں اس کے ساتھ اس کے گھر جاسکوں اور شام ہونے سے پہلے پیلے والپس آجاؤں۔ دادا جان نے تاکید کر دی کہ اگر ذرا سا بھی اندھیرا ہو گیا اور تونہ آئی۔ تو پھر میں تجھے اس گھر میں کبھی زندہ نہ رہنے دوں گا۔ بلکہ زہر دے دوں گا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ایک لڑکی۔ بلکہ جوان لڑکی رات کو کہیں باہر اپنی سنگی ماں کے پاس ہی کیوں نہ رہے! یا کسی سہیلی کے پاس رہے! تو پھر وہ زندہ رہنے کے قابل نہیں ہوتی۔ اس لیے مجھے پہلے ہی والپس آنا چاہیے۔ میں نے آنے کا وعدہ کر لیا۔ اور چلی گئی۔

راستے میں چلتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے پتھر سے نکل کر کھلی ہو امیں آگئی ہوں۔

آسیبہ نے بازار سے کچھ چیزیں خریدی تھیں۔ پہلے وہ خریدیں اور پھر ہم گھر گئے۔ اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے شروع ہو گیا۔ اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اختر کے سامنے کیسے جاؤں گی! کیونکہ بہت دن ہو گئے تھے۔ اُدھر گئے آسیبہ کے کمرہ میں کچھ دیر بیٹھے۔ آسیبہ سامان وغیرہ باندھنے میں مصروف ہو گئی۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا اور اختر بھی آگیا۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ یہ تباہ راستے روز تک تم آئیں گی!

نہیں! یہ بھلا کیا بات ہوئی! ہم تو روزانہ یاد کریں۔ اور تم آؤی نہ اور اب تو آسیبہ جا رہی ہے۔ دم بھلی ہی نہ آسکو گی۔ اور اگر ایسی ہی بات ہے۔ تو پھر میں نہیں آج جانے ہی نہیں دوں۔۔۔

اور نہ جانے کے خیال نے میرے سامنے موت کو لا کر کھڑا کر دیا بھلا کبھی ایسا بھی ہو ہے۔ کہ میں گھر نہ جاؤں۔

میں نے اس سے کہا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں گھر نہ جاؤں۔ اور یہاں رہوں۔ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ کبھی نہیں ہو سکتا۔

اور اگر میں ایسا کر کے دکھا دوں تو! میں سہم گئی۔ خدا کے لیے اختر ایسا نہ کرنا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا میرے منہ سے اپنا نام سن کر اختر اس قدر خوش ہوا کہ میرے ہاتھ کو کئی بار چوم ڈالا۔ لگا پہلے یہ وعدہ کرو کہ تم مجھے اختر نام سے ضرور پکارو گی۔ پھر شادی تک تمہیں ات رہنے دوں گا۔

اور میں نے وعدہ کر لیا۔۔۔ اور اپنا ہاتھ کچھن لیا۔ میرا ہاتھ مٹھنا ہو گیا تھا۔ لاکھ نہیں یہ کیا عادت ہے کہ وہ میرا ہاتھ ضرور چومنا ہے۔ نہ جانے وہ کیوں ایسا کرتا ہے۔۔۔ مجھے اس کا ہاتھ چومنا اچھا نہیں لگتا۔ میرے خوابوں کا شہزادہ تو ایسا نہیں ہے۔۔۔ رات کا ہاتھ چومے۔ میں اختر کو کہوں گی کہ وہ ایسا نہ کرے۔ شادی کے بعد بے شک چوم۔ ابھی چومنا گناہ ہوتا ہے۔ اور پھر محبت میں بھلا ہاتھ چومنا کیا ہوا۔ محبت تو ایک بہت چیز ہے۔ جس میں صرف دو دل ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ اور دور دور نہیں۔ اور نہیں مکھا جا رہا۔

انہی آوازیں دے رہی ہیں۔ اب تو مکھنا بھی بہت مشکل ہے۔ دادا جان کہتے ہیں کہ جب تیرے امتحان ختم ہو گئے ہیں۔ تو اب بیٹھ کے کیا مکھتی ہے۔ ان سے چھپ ڈاڑھی مکھتی ہوں۔ دل کے اندر یہ خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ میں ان سب باتوں

رات گئے دیر تک میں سوچتی رہی۔ موسم بہت اچھا ہو گیا ہوا ہے اور مجھے فیند نہیں
 ہوتی۔ میں بستر پر لیٹی دیر تک اختر کے متعلق سوچتی رہی۔ اختر کچھ عجیب سا لڑکا لگتا ہے
 نے کیا ہو گا! اور پھر اس کے دوست کیسے ہیں! وہ کون ثریا ہو گی جو اسے ملنے جاتی ہو گی
 بوجو کوئی بھی ہے۔ مجھے اس سے کیا۔!

مگر مجھے گھر سے جانے کی اجازت کیسے ملے گی!
 مجھے دادا جان سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ مجھے جانے کی
 ت دے دیں۔

نہیں نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ کبھی نہیں جاؤں گی اور یہ فیصلہ کر کے سو گئی۔

کو دکھتی بھی جاؤں۔ اگرچہ ڈر لگا رہتا ہے۔ کہ کہیں کوئی پڑھ نہ لے۔
 مائے اگر کوئی پڑھ لے تو غضب ہی ہو جائے۔ لیکن نہیں۔ میں تو اسے بڑا چھوڑ
 کر دکھتی ہوں۔ اور اگر کبھی کوئی ایسا وقت آیا تو انہیں جلا کر رکھ کر دوں گی۔

آسیہ چلی گئی ہے۔ اختر نے وعدہ لیا ہے۔ کہ میں کسی نہ کسی بہانے مزدور اس
 گھر آیا کروں۔ میں نے اسے کہا۔ کہ اس کی اتنی اور گھر والے کیا کہیں گے۔ کہ آسیہ تو ہے نہ
 تو اب یہ آن کر کیوں بیٹھی رہتی ہے!

تو اختر نے کہا۔ کہ وہ پھلا دروازہ کھول کر رکھا کرے گا اور میں چپکے سے آن کر چپ
 سے چلی جایا کروں۔ مجھے یہ بات بڑی خوفناک لگی۔ بڑا ڈر لگا۔ یعنی چوروں کی طرح آؤں
 اور چوروں کی طرح جاؤں۔ مائے اللہ! میں تو ایسا کبھی نہ کر سکوں گی۔ کبھی نہیں ادا
 میں نے اختر کو صاف صاف کہہ دیا کہ میں ایسا نہیں کر سکوں گی۔

مگر اختر نے بتایا کہ ایسا کرنے میں بالکل حرج نہیں ہے اس کے کئی ایسے دوست ہیں
 جنہوں نے اس کو بتایا ہوا ہے کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے ایک اسکا دوست سید
 ہے جس کو ایک لڑکی ثریا سے پیار ہے گھر والے ملنے نہیں دیتے اور وہ یوں ہی چھپ چھپ
 کر آجاتی۔ اس میں بھلا کیا ہرج ہے! یہ بات اختر نے مجھے قائل کرنے کو کہی تھی۔ مگر مجھے یہ
 بات سن کر اور بھی خوف لگا اور میں یہ کہہ کر کہ گوشش کروں گی اسے کی جلدی
 میں تو ایسا نہ کر سکوں گی

آج ہمارے ہسائے کے گھر میں رات بھر قوالی ہوتی رہی۔ بہت سے
 لوگ جمع تھے۔ عورتیں اور مرد۔ عجب ہنگامہ برپا تھا۔ دادا جان
 بھی سننے کو گئے ہوئے تھے۔ آج ہمارے گھر ہمارے رشتے کی ایک
 چھوٹی جان ہیں۔ وہ آئیں۔ بڑی باتیں کرتی رہیں۔۔۔۔۔ ان کو کہیں مکان نہیں
 ملتا تھا۔ اور وہ بڑی پریشان تھیں۔۔۔۔۔ دادا جان سے بہت دیر تک
 بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔۔۔۔۔ میرے متعلق بھی کرتی رہیں کہ کہیں رشتہ وغیرہ کیا ہے
 بائیں۔ والدہ نے کہا ابھی تو پڑھ رہی ہے۔ کہتی ہے میں نے شادی نہیں کرنی۔
 پڑھ مکھ کر اتانی بنوں گی۔

پھوپھی کہنے لگی۔ غضب خدا کا۔ کہیں ہم میں ایسا بھی ہوا ہے کہ جوان
 لڑکی کی شادی نہ کی جائے۔ اور اسے پڑھایا جائے۔ تیری تو مت ماری ہوئی ہے
 کہیں ایسا نہ کر بیٹھنا۔ تمہیں تو اس کی ٹال میں ٹال نہیں ملانی چاہیئے۔ وہ کہنے

لگیں۔ میں تو سمجھاتی ہوں مگر ابھی بچی ہے نا۔
مجھے اس کی یہ بات بہت بُری لگی۔ مگر میں خاموش ہو گئی۔ اس کے جلنے کے بعد میں نے اتنی سے کہا۔ اتنی! اگر آپ نے اسے پھر یہاں آنے دیا تو میں کبھی آپ سے نہیں بولوں گی۔ اتنی کہنے لگی پگلی! اگر وہ یہاں آجائے۔ تو کیا میں اسے نکال دوں!

یا خدا! یہ کیا بیٹھے بھٹائے مصیبت آنے والی ہے۔ میری مدد کرنا۔
کہاں میرے خوبصورت سوئٹرز لینڈ جا کر زندگی بسر کرنے کے خواب اور کہاں اسکا لڑائیٹا۔ جو جب سے لاٹ صاحب کے دفتر میں ۱۰۰ روپیہ ماہوار پر نوکر ہوا ہے اور نے دھوئی کی جگہ سینٹ پہننی شروع کر دی ہے۔ اور سر پر تیل لگا کر ترچھی مانگ نکالنی شروع کر دی ہے۔ سبھی رشتہ دار اپنی بیٹیاں اس کے ساتھ بیٹنے کے خواب دیکھنے لگے۔ میرا اور اسکا بھلا کیا ساتھ! ان لوگوں کو کیا معلوم کہ میرا ذہن کیسا ہے! میرا تو ان باتوں دم گھٹتا ہے جن باتوں سے انکا چہرہ کھلتا ہے۔

ہائے! مجھے ایک تنگ سے مکان میں ایک ظالم ساس اور نامراد قسم کے جواہری سے زندہ کے ساتھ باورچی خانے کے دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرے میں بیٹھ کر زندگی بسر کرنے سے تو موت لاکھ بار مبارک ہو۔

میں تو کبھی یوں پسو کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ میں تو تازہ ہواؤں اور کھلے نخلستانوں کی ہواں میں یہاں کیسے آگئی ہوں۔

یا خدا! تو نے مجھے کہاں پیدا کر دیا ہے، آخر تمہیں کیا معلوم کہ تمہاری زاہدہ کن مشکلوں میں پھنسی ہوئی۔ کیا تم بھی مجھے اس مشکل سے نہ نکالو گے۔

آخر! اس تاریک اور سیاہ رات کے اندھیرے میں اگر کوئی جگنو چمکتا ہے تو وہ مرنے والا ہو۔ صرف تم نہ:

دن گزر رہے ہیں۔ پھوپھی نامراد روزانہ آتی ہے۔ اور اب تو کل سے وہ پانامڈ یہاں آن کر رہے گی۔ جب تک اس کو مکان نہیں ملتا۔ دادا جان کہتے ہیں یہیں آجائے۔ سنا ہے اس کی ایک فتنہ بیٹی اور ایک دنڈوا بیٹا بھی ہے۔ جس کی دو بیویاں مرچکی ہیں میں نے بہتیز اور لگا یا ہے۔ میں روئی اور چینی ہوں اور یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر وہ یہاں آن کر رہے گی تو میں گھر چھوڑ دوں گی۔ اتنی تو چپ چاپ رو دیتی ہیں۔ مگر دادا گالیاں دیتا اور مارتا ہے۔ یا خدا! میں کیا کروں! وہ تو ایک فتنہ عورت ہے اور پھر اسکا بیٹا یا لندہ ہماری مدد کر!

اس نامراد پھوپھی نے تو کل یہاں تک دادا جان کو کہہ دیا تھا کہ زاہدہ کو میری بیٹی بنا دیں۔ میرا بیٹا تو اب لاٹ صاحب کے دفتر میں نوکر ہو گیا ہے۔ سو روپیہ ماہوار کماتا ہے۔

بڑے بڑے گھر والے اپنی بیٹیاں دینے کو تیار ہیں۔ مگر میں تو اپنے ہی خاندان کی بیٹی

میرا کام تجھے سمجھانا تھا۔ اب سوچ سمجھ کر جلدی سے یہ کام کر ڈال۔

دادا جان بولے۔ دیکھ مجھے میں اس حرامزادی کا راتوں رات نکاح کر دیتا ہوں۔
 پھوپھی بولی۔ خدا کے لیے ابھی اوپر جا کر کچھ نہ کہنا۔ کسی اور بات پر بولنا۔۔۔۔۔ ورنہ
 یہاں بیٹیاں کہیں گی کہ اسے آئے ابھی دو دن بھی نہیں ہوئے اور لگی لڑائیاں ڈالتے۔ کیا
 باندہ!۔۔۔۔۔ تم آرام سے بات کرنا یا کسی اور بات پر سمجھانا۔ اور پھر نیچے کھسک پھسک کر
 داریں آتی رہیں۔

میرا تو دل ہل گیا۔ اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا کہ اب تو وہ کچھ ہو گا جو کبھی نہ
 داتا تھا۔ اور میں پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ اُمی سمجھاتی رہیں۔ مگر آنسو تھکے کھٹنے کا
 مہی نہ لے رہے تھے۔

آج آسہ کے گھر جانا تھا۔ آخر میرا انتظار کر رہا تھا، مگر دادا جان صبح سے ہی
 اب کہ گھر بیٹھ گئے تھے۔۔۔۔۔ میں نے منہ ماتھ دھو کر بال گوندھنے کے
 لنگھی اٹھائی۔ اور آئینہ کے سامنے جا کھڑی۔ دادا جان نے گھور کر دیکھا اور اٹھ
 اس آگئے۔

کہاں جا رہی ہو؟

میں نے سہم کر ڈرتے ڈرتے کہا۔

دادا جان جی! میری ایک سہیلی کی ماں بہت بیمار ہے۔ کل اس نے اپنا نوکر بھی بھیجا
 ڈھرنے کو ضرور آؤ۔ وہاں جانا ہے۔

دادا جان نے کرٹک کر کہا۔

سہیلی کی ماں بیمار ہے۔ یا تیرا بار بیمار ہے۔

خدا کے لیے کچھ تو خیال کرو۔ یوں یا ریا کا لفظ منہ سے کہتے ہوئے تمہیں شرم نہیں

پھوپھی بعد اس زبڈوے کے ہمارے گھر آگئی ہے۔ اور نجی منزل اسے دے
 دی گئی ہے۔ آسہ کا نوکر کل رقعہ لے کر آیا تھا کہ آسہ کی اتنی تمہیں بلاتی ہے۔ تم ضرور آؤ۔
 جونہی اس کے نوکر نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور پوچھا۔ ”زائدہ بلی ہے؟“

تو پھوپھی اور اس کے زبڈوے بیٹے۔ دونوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ بلکہ خود بھی
 کھڑے ہو گئے۔ کمرہ سے اٹھ کر ڈیوڑھی میں آگئے اور چپک کے پیچھے سے باہر لگی میں
 جھانکنے لگے۔ میں نیچے انڑی لیسہ بھی ساتھ تھی۔ اس نے نوکر سے رقعہ لے لیا۔ میں نے
 دوسری طرف مکھ دیا کہ کل آؤں گی۔ اور ادھر آگئی۔ دادا جان گھر پر نہیں تھے کچھ دیر کے
 بعد وہ آئے تو نیچے ہی بیٹھ رہے۔ پھوپھی نے دادا جان کو بتایا کہ کسی کا رقعہ آیا تھا اور
 اس نے مسکراتے ہوئے کیا۔ اور اس سے کہا کہ اب تم جلدی سے چلے جاؤ۔ کوئی آؤں جا
 مگر میں اوپر کھڑی دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔ ماں تو اسکی اندھی ہے۔ مگر تو تو یوں عزت نہ بیج
 آخر اس کی اور ہماری دو عزتیں نہیں ہیں۔ تو اس کو کہیں باندھ دے اب۔ ورنہ میری یہ بات

یاد رکھنا کہ اس لڑکی کے رہنے والے پھن نہیں ہیں۔ شام کو اکیلی کو تھکے پر چلی جاتی
 ہے اور تنہا بیٹھتی ہے۔ سوچتی رہتی ہے۔ کام کاج کرتی نہیں۔ مجھے دیکھ کر منہ دوسری طرف
 کر لیتی ہے۔ کل میں نے ننھے انجم سے کہا۔ جابازار سے مجھے جاکر مرچیں لا دے۔ میں نے
 دفتر دوٹی بھیجی تھی۔ اور مرچیں، ہو گئی تھیں۔ میں نے انجم کو آواز دی۔ کہ جاکر بازار سے لا دے
 تو اسے اس نے سکھا دیا کہ جاکر کہہ دے میں کرتی نوکر نہیں۔

میں نے بھی بھائی! یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے۔ یہ سب ناک کاٹنے والی باتیں ہیں۔

آئی -

اتنی نے آتے ہی دادا جان کو کہا۔

دادا جان بوسے :-

توچپ رہ

کیوں چپ رہوں! کیا میں اس کی ماں نہیں!

تو اندھی ہے۔ ماں ہو یا نہ ہو۔ مجھے اس کا نہیں پتہ۔

اور تیری دوا تکھیں نہیں۔ چھ آنکھیں ہیں۔ آج توچھ آنکھوں سے ہم کو دیکھ رہا ہوں۔

دو تیری اور چار تیرے نچلے کمرہ میں رہنے والے مرنے والوں کی۔

خبردار! جو تو نے زیادہ بکواس کی۔ تو اس کو خراب کر کے چھوڑے گی۔ تجھے تو کچھ

ہی نہیں آتا۔

اور دادا جان کتنا زیادہ بڑبڑاتے رہتے تھے۔ میں خاموش ایک طرف بیٹھ

اور جب دادا جان بولتے ہوئے نیچے اتر گئے تو اتنی نے ان کو پیار سے کہا۔ مت جا

بیٹی تو وہاں۔ تم کہہ دینا تھا کہ میرا دادا بڑا سخت قسم کا آدمی ہے۔ وہ نہیں آئے

اور میں رونے لگ، پڑی۔

اتھی اماں! آج مجھے کسی طرح اجازت لے دو۔ آج میں نے ضرور جانبہ۔

نے اسے کہلا بھیجا تھا کہ ضرور آؤں گی۔ میری سہیلی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔

لیکن بیٹی میں تجھے کیسے بھیجوں!

تیری قسمت ہی ایسی تھی کہ وہ بھی نچلے کمرہ میں آن لسی ہے تو کچھ روز تک سہیلی

ماں جانا بند کر دے۔ یہ کہیں جا لیں تو پھر چل جانا۔

اتنی تو یہ کہہ کر کام میں لگ گئیں۔ اور میں دیوار کے ساتھ منہ لگا کر رونے لگ

اختر میرا انتظار کر رہا ہوگا اگر میں نہ گئی تو وہ نہ جانے کیا سمجھے گا! میرا دل کتنا چاہ

کہ بھاگ کر جاؤں ساری دیواریں اور دروازے توڑ کر اس قید خانے سے

جاؤں اور اختر کے چوڑے سینے کے ساتھ لپٹ کر روؤں۔ خوب روؤں۔ اور اسے

کہ میرا خالم دادا ہم پر کس قدر ظلم کرتا ہے!

وہ مجھے تم سے ملنے نہیں دیتا۔ اگر اس کو ہمارا پتہ چل گیا تو وہ ذبح کر ڈالے گا۔

اچھے اختر! پھر کیا ہوگا! پتہ نہیں کیا ہوگا؟

میں کیسے جاؤں؟

روتنے روتے خود ہی چپ ہو گئی۔ اور اس سی ہو کر اوپر چھپت پر آن کر لیٹ گئی۔

دوپہر کو اتنی نے کھانے کے لیے آدازیں دیں۔ مگر میں نے بھلا کیا کھانا تھا! ہمارے

پاس کھانے کو غم جو ہے۔

اتنی نے بہتر اصرار کیا۔ مگر میں نے دوپہر کو روٹی نہ کھائی۔ دو بجے کے قریب دادا جان

کے ایک دو بوطھے دوست آگئے جو ان کو ساتھ لے کر چل ویسے کہ آج رات خیر دین کے

گھر دعوت ہے۔ ابھی چلو وہاں۔ ذرا میلہ رونق رہے گا۔

اودہ اللہ! تو کس قدر اچھا ہے! تو نے میری دعا سن لی ہے پتہ نہیں میری دعا سنی ہے

یا اختر کی کیا وہ بھی میرا انتظار کر رہا ہے! ضرور کر رہا ہوگا۔

میں ابھی جاؤں گی۔ اور اختر کو سارا کچھ سناؤں گی۔

اور پھر میں جلدی جلدی تیار ہو گئی

اختر کھڑکی کے ساتھ لگا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میٹر تھیلوں پر مجھے کوئی نہ ملا۔ میں سیدھے

اختر کے کمرہ میں چلی گئی۔

وہ اندر بیٹھا تھا۔

پھر اس نے پوچھا کہ میں نے اتنی دیر کیوں لگا لی ہے! میری آنکھیں کیوں سو جی ہوئی

میں!

اور پھر میں نے رو کر سارا حال سنایا۔

وہ یہ سارا کچھ سن کر چپ ہو گیا۔ پھر میں نے اختر سے کہا۔

اختر! اب میں نہ آسکوں گی میرا آنا ہمیشہ کے لیے مشکل ہے۔

اختر نے مجھے گلے کے ساتھ لگایا۔ میرا سارا جیم مرز نے لگا۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ

کہ میں کوئی فکر نہ کروں۔ اس کے ہوتے کوئی مجھے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ چند روز کے اندر ہی ہمارے گھر رشتہ بھجوا دے گا اور پھر..... پھر زندگی ان کے لیے ایک ایسا دلنشین خواب بن جائے گی..... جسے کوئی بھی نہ توڑ سکے۔

اس بات نے مجھے کس قدر خوشی بخشی تھی! میں بیان نہیں کر سکتی۔ پھر اہم کتنی ہی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اختر کس قدر اچھا ہے۔ وہ لمحے کس قدر سہانے اور پیارے تھے جو اختر کے پاس گزرے۔ اختر مجھے کتنا پیارے کرتا رہا تھا۔ وہ جب پیار سے میری طرف دیکھتا ہے تو میرا دل اتنی تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ آج اس نے کئی بار میرے ہونٹوں کو چوما۔ میرے ہاتھوں کو چوما اور ہونٹ چومتے ہوئے اختر نے بتایا تھا کہ وہ مجھے بے حد چاہتا ہے۔

آج میرے ہونٹوں پر ایک عجیب قسم کی سرخی پھیلی ہوئی ہے۔ آج میرے ہونٹ چمک رہے ہیں۔ کیا اختر بیچ مچ سے پیار کرتا ہے۔ لیکن پیار کو تو جسم سے کوئی بھی تعلق نہیں ہوتا..... پھر اختر ایسا کیوں کرتا ہے۔ وہ روحانی پیار کیوں نہیں کرتا۔ جس میں ایک دوسرے کو گلے نہیں لگا جاتا۔ بلکہ صرف ایک دوسرے کو پیار سے دیکھا جاتا ہے۔ پیار سے سوچا جاتا ہے۔ پتہ نہیں پیار کیا ہوتا ہے کی پتہ ہونٹ چومنے کا نام ہی پیار ہوتا ہوگا۔ اختر کو ٹھیک پتہ ہوگا۔ اختر مجھ سے بڑا اور میں اختر سے کتنی ہی چھوٹی ہوں۔

اچھا اب اگر میں اختر سے ملی تو اس سے پوچھوں گی کہ اختر پیار کیا ہوتا ہے؟ اور پیار کیسا ہوتا ہے؟ ضرور پوچھوں گی۔ لیکن یا خدا! میرے پیار کا علم کسی کو نہ ہو۔ یا خدا! میری مدد کرنا۔ ان لوگوں کو اگر پتہ چل گیا۔ تو یہ لوگ مجھے زندہ جلا دیں گے۔ پھر میں اختر سے کبھی نہ مل سکوں گی۔ پھر اختر میرے بغیر کیسے زندہ رہے گا!

نہیں نہیں میں کبھی نہیں مروں گی۔ میں اختر کے لیے زندہ رہوں گی۔ میں اختر سے ہرگز نہیں ہٹوں گی۔ وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے سارا کچھ بھول جاتا ہے۔ صرف وہی یاد کروں گی۔ وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔

کچھ روز کے بعد میری اختر سے شادی ہو جائے گی۔ پھر ہمیں ملنے سے کوئی نہ روک سکے گا۔ ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔ مائے پھر کس قدر اچھا ہوگا! وہ دن کب آئے گا؟ کل سے میں باقاعدہ اٹھ کر نماز پڑھا کروں گی۔ اور خدا سے دعا مانگوں گی کہ میری شادی اس سے ہو جائے۔ مائے! دادا جان کی خواہشیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ سارے ہمسائے میری قسمت پر حیران رہ جائیں گے۔ اتنی جس روز مجھے دلہن بنے کجواب کے کپڑوں میں دیکھے گی تو اس قدر خوش نہ ہوگی۔

میری نسیم بہن اور انجم بھتیجا! دونوں خوشی سے ناچیں گے۔ میں ان دونوں کے بغیر اس وجاؤں گی۔ میں اتنی کے بغیر بھی اداس ہو جاؤں گی۔ پھر کیا ہوگا؟..... لیکن ہم یہ مکان ہی چھوڑ دیں گے۔ آج میں نے اختر سے کہا تھا نا..... کہ اختر! شادی کے بعد میں تمہارے ساتھ ملک ملک کی سیہ کردوں گا اور تم ساری دنیا کا چکر لگائیں گے۔ اختر میری یہ بات مان گیا تھا۔ اختر کتنا اچھا ہے۔ اچھے اختر! ہمیشہ اچھے اختر رہنا۔ بڑے اختر کبھی نہ بننا۔ ورنہ میں مر جاؤں گی۔

پھر اختر میرے بغیر کیسے زندہ رہے گا!

نہیں نہیں میں کبھی نہیں مروں گی۔ میں اختر کے لیے زندہ رہوں گی۔ میں اختر سے ہرگز نہیں ہٹوں گی۔ وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے سارا کچھ بھول جاتا ہے۔ صرف وہی یاد کروں گی۔ وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔

کچھ روز کے بعد میری اختر سے شادی ہو جائے گی۔ پھر ہمیں ملنے سے کوئی نہ روک سکے گا۔ ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔ مائے پھر کس قدر اچھا ہوگا! وہ دن کب آئے گا؟ کل سے میں باقاعدہ اٹھ کر نماز پڑھا کروں گی۔ اور خدا سے دعا مانگوں گی کہ میری شادی اس سے ہو جائے۔ مائے! دادا جان کی خواہشیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ سارے ہمسائے میری قسمت پر حیران رہ جائیں گے۔ اتنی جس روز مجھے دلہن بنے کجواب کے کپڑوں میں دیکھے گی تو اس قدر خوش نہ ہوگی۔

میری نسیم بہن اور انجم بھتیجا! دونوں خوشی سے ناچیں گے۔ میں ان دونوں کے بغیر اس وجاؤں گی۔ میں اتنی کے بغیر بھی اداس ہو جاؤں گی۔ پھر کیا ہوگا؟..... لیکن ہم یہ مکان ہی چھوڑ دیں گے۔ آج میں نے اختر سے کہا تھا نا..... کہ اختر! شادی کے بعد میں تمہارے ساتھ ملک ملک کی سیہ کردوں گا اور تم ساری دنیا کا چکر لگائیں گے۔ اختر میری یہ بات مان گیا تھا۔ اختر کتنا اچھا ہے۔ اچھے اختر! ہمیشہ اچھے اختر رہنا۔ بڑے اختر کبھی نہ بننا۔ ورنہ میں مر جاؤں گی۔

جاتا تھا۔ اس عورت کی دونوں آنکھیں نکال لوں۔ بھلا میرا اور اس کا کیا ساتھ! یہ تو
 بے جلاتی ہے۔ اور چو لہا گرم کرتی ہے۔ تو سارا کمرہ دھوئیں سے بھر جاتا۔
 بہتر لگتی ہوں کہ کمرہ کے دروازے کھول دے۔ دھواں باہر نکل جائے
 دروازے نہیں کھولتی۔ اس کا تو دھوئیں میں بھی بیٹھ کر آنکھ سے آنسو نہیں نکلتا
 میرے تو یونہی بہنے لگتے ہیں۔

مائے! میری پیاری ماں! کیا تو اپنی بیٹی کو اس دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرہ
 دم گھٹنے کو چھوڑ دے گی!

پیاری امی! کیا تو میری شادی اس گندے سے میلے سے آدمی سے کر دے گی
 پی تو بچوں پر روزانہ تیل کی مالش کرتا ہے۔ اور لاٹ صاحب کے دفتر میں میرا
 گزار کر جب رات کو گھر آتا ہے۔ اور ماں کے گھٹنے کے ساتھ لگ کر روٹی کھاتا
 ۔ اور روزانہ ماں کو کہتا ہے۔ ماں اب میری شادی کر دے۔ ورنہ میں خود
 لوٹی لے آؤں گا۔ پچھلے دنوں اس نے کچھ روپیہ بھی اکٹھا کر لیا تھا۔ جس کا ایک
 یوپی خرید لایا ہے۔ اور اب تو ماں کی خوشی کی حد ہی نہیں۔ کل اماں سے کہہ رہی
 ۔ مائے بہن! ایسے گھر میں کون اپنی بیٹی نہ دے گا۔ جہاں ریڑیو بھی ہے۔ اور
 ایک ہی اکڑتال لڑکا ہے۔ کل کلاں کو گھر کی یہی مالک ہوگی۔ میرا کیا ہے۔ چند روز
 نہ لگے۔ یہ گھر آگئی۔ تو میری بھی آخرت اچھی ہو جائے گی۔ چین۔ سے دن گزار
 لے۔ اور سوتو بہن! اب مکان کو اے پر کیا لینا!

اب تو کچھ روز تک بیٹا مکان خود ہی خرید لے گا۔ چاچی عائشہ کی گلی میں ایک
 ناغالی ہوا ہے۔ اس کی بات چیت ہو رہی ہے۔ بچی ہو گئی۔ تو انشا اللہ
 ہاں لے لیں گے۔

اور میری اماں ہوں ماں کرتی رہی۔ وہ تو یہاں بالکل میری شادی نہیں کرنا
 کر دے۔ بھو بھو آدھر آن کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی
 مگر نہیں۔ پتہ نہیں کیا ہو گا! آج دادا جان امی سے پھر رشتہ کے بارے میں
 کرتے رہے۔ بھو بھو آدھر آن کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی

کل! سارا دن میں بہت خوش رہی تھی۔ اختر سے پرسوں ٹی تھی۔ پرسوں کا دن تو
 معلوم ہوتا ہے۔ ہرگز راہو! دن خواب کی طرح لگتا ہے۔ مگر آج میں بہت اداس ہوں
 آج ذرا سی بات پر دادا جان نے نسیم کو اس بُری طرح مارا کہ رو کر اس کی آنکھیں سوج
 گئی ہیں۔

اے ظالم دادا! تجھے اس معصوم بچوں پر ماتھا اٹھاتے ہوئے ذرا رحم نہ آیا۔
 میری نسیم بہن! میری جان نسیم بہن! امیرے گلے لگ جا۔
 یہ ظالم دادا تجھے کبھی نہیں مار سکتا۔ تو مت رو۔ تو مت دکھی ہو۔
 آج نسیم نے جب پیار سے یہ کہا تھا کہ باجی! جب آپ کی شادی ہو جائے گی
 اور آپ یہاں سے چلی جائیں گی تو پھر مجھے کون پیار کرے گا۔

پھر دادا جان بہت مارا کریں گے۔
 تو میں نے اسے بہت پیار کیا تھا اور کہا تھا کہ جب تک تو بڑی نہ ہو جائے گی
 ۔ میں شادی ہی نہ کروں گی۔ اور وہ خوش ہو گئی تھی۔

لیکن اس بچگی کو کیا خبر کہ میری شادی تو بہت جلد ہو جائے گی۔ پھر میں
 اور انجم کو بہت اچھے انگریزی اسکول میں داخل کرادوں گی۔ میں ان کو ہسٹل میں دا
 کرادوں گی۔

مگر نہیں۔ پتہ نہیں کیا ہو گا! آج دادا جان امی سے پھر رشتہ کے بارے میں
 کرتے رہے۔ بھو بھو آدھر آن کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی

پہلی تھی۔ مگر چونکہ مجھے افسوس کرنا نہیں آتا تھا۔ اس لیے میں ان کے گھر ہی نہ گئی نہ اس آخری دفعہ منہ دیکھا۔ بلکہ گھر ہی میں روتی رہی۔

آسیہ کا گھر آگیا۔ سیدھی اختر کے کمرہ کی طرف بڑھی۔ دروازہ بند تھا۔ تالا لگا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر بے حد افسوس ہوا۔ کہ اتنی مشکل سے آئی تھی۔ نہ جانے اب آنا کب ہو۔ تو کیا کروں!..... ابھی میں کھڑی یہی سوچ رہی تھی۔ کہ اختر آگیا۔

مجھے دیکھ کر اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں آگئی ہوں۔ پھر ہم اندر جا کر بیٹھ گئے۔ درپھر میں نے اسے اپنے پاس ہونے کا بتایا اور آسیہ کا بھی بتایا۔ آسیہ کے فیل ہونے اس نے اس نے ذرا سا بھی منہ نہ بنایا۔ بلکہ کہنے لگا پھر کیا ہوا؟ اگلے سال پاس ہو جائے گا اور میرے نمبروں کا سن کر وہ خوشی سے پاگل ہو گیا۔ کہنے لگا بتاؤ کیا تحفہ لوگا! میں نے کہا کچھ نہیں لوں گی۔ کچھ نہیں۔ اس نے بہت اصرار کیا تو میں نے کہا اپنی تصویر دے دے۔ اس نے اس نے مجھے ایک بہت پیاری تصویر دے دی۔ مگر یہ پوچھا دکھو گی کہاں! میں نے کہا کہ اپنے کپڑوں کے صندوق میں۔

اور وہ ہنس پڑا۔

پھر وہ کہنے لگا کہ اب تو تم کالج نہیں داخل ہو گی۔

مگر یہ سن کر بہت اداس ہو گئی۔ بھلا میں کہاں کالج میں داخل ہو سکتی ہوں! یہ تو خواب میں بھی ممکن نہیں..... میں نے اسے بتایا کہ دادا جان مجھے کسی قیمت پر بھی کالج میں داخل نہیں کرنا چاہتے۔ اب تو وہ میری شادی کر رہے ہیں۔ اور پھر میں نے اسے لڑکے کا بھی بتا دیا۔

اختر یہ سن کر چپ ہو گیا..... اور تھوڑی دیر کے بعد پھر خود ہی بولا کہ میں آج رات اتنی سے بات کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کم از کم بی اے ضرور کر لو۔ اس کے بعد شادی کریں گے۔ ہم منگنی اب کر لیں گے اور شادی چار سال کے بعد۔ میں آج رات اتنی سے بات کروں گا۔ تاکہ وہ پیغام لے کر تمہارے کالج میں داخلہ سے پہلے پہلے منگنی کی بات

اختر سے ملے کئی روز ہو گئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اختر سے کبھی نہیں ملتی تھی۔ کبھی نہیں ملتی تھی۔ میری سہیلی سعیدہ آج آگئی۔ کہ چلو قدسیہ کے آ جا کر اپنا نتیجہ معلوم کرتے ہیں کہ پاس ہو گئے ہیں یا فیل کیونکہ اس کا بھائی یونیورسٹی ہے۔ اور ہم نے رول نمبر اسے دیئے ہوئے تھے۔ آج ۶ مئی ہے۔ دس مئی ہمارا نتیجہ شائع ہو جائے گا۔ آج اسے ہر روز کے بعد۔

دادا جان گھر پر نہیں تھے۔ اُمی کو کہہ کر میں سعیدہ کے ساتھ قدسیہ کے ہاں گئے۔ دل دھڑک رہا تھا۔ کہ خدا جانے یہ کیا خبر سنائے گی۔ اس نے آتے ہی مبارکباد اور مجھے دوسری دوسری مبارکباد دی کیونکہ میرے ۶۵۶ نمبر آئے تھے۔ اور میں فرسٹ آئی تھی اور مجھے وظیفہ بھی ملا تھا۔

مائے اللہ! یہ خبر اتنی اچھی تھی کہ مجھے یوں لگتا تھا۔ جیسے میری جھولی میں لٹ کر آن کر رہے۔ آسیہ فیل ہو گئی تھی۔ جہاں ایک خبر نے مجھے خوشی پہنچائی تھی وہاں دوسری خبر نے مجھے اداس کر دیا.....

اب میں اختر کو جا کر سب سے پہلے یہ خوشخبری سنانا چاہتی تھی۔ مگر..... یہ خیال کہ وہ آسیہ کا سن کر اداس ہو گا۔ مجھے اداس کر رہا تھا۔

بہر حال..... میں بغیر کوئی فیصلہ کئے سیدھے اس کے گھر کی طرف بڑھ گئی۔ راستے میں سوچتی گئی کہ آسیہ کے فیل ہونے کا کس طرح افسوس کروں گی۔ افسوس کرنا نہیں آتا تھا۔

ایک دفعہ میری ایک پیاری سہیلی شکیلا مر گئی تھی۔ حالانکہ وہ میری بے حد

پکی کر لیں۔ پھر تو تمہارے دادا جان کو پڑھانے میں کوئی غدر نہ ہو گا۔

مگر میں نے کہا۔ اختر تمہاری اتنی کیسے مانیں گی!

مگر اختر نے کہا۔ تم اسکا کوئی خیال نہ کرو۔ اس کے بعد میں دو تین گھنٹے اور پاس رہی۔ وہ مجھے بہت پیار کرتا رہا۔ کبھی میری آنکھوں کی تعریف کرتا اور کہے بے بالوں کی۔ کبھی میرے بھوئے بھالے چہرہ کی۔ اور کبھی میری سادی طبیعت کی۔ آج پاس ہونے کی خوشی میں اس نے مجھے بہت پیار کیا۔ واپسی پر گھر آئے میں نے اسے پھر کہا۔ اختر! داخلے تو کل شروع ہو رہے ہیں۔ دس روز تک تم دس دنوں تک بات بچی کر لینا۔ ورنہ بہت تیری بات ہوگی۔

اور اختر نے پکا وعدہ کر لیا۔ اور پھر میں آگئی۔

بہت دیر ہو گئی تھی۔ شام ہو گئی تھی۔ مگر آج مجھے کوئی ڈر نہیں لگا۔ آج میں نے پاس ہونے کی خوش خبری گھر میں سنائی تھی آج بے شک دیر گھر آتے ہی اتنی کو یہ خبر سنائی۔ دادا جان کو بتایا۔ دادا جان کا غصہ۔ چہرہ خوشی کے لطیف جذبات میں بدل گیا۔ اور انہوں نے زندگی میں پہلی بار پیار کیا۔ ان کے پیار کرنے سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور میں رو پڑی۔

دادا جان حیران ہو گئے کہ خوشی کے موقع پر یہ آنسو کیسے؟

اے دادا! تجھے کیا خبر! کہ تیرے اتنا پیار کرنے سے میرا دل کیا میرے ذہن میں تو تیرا تصور ایک ظالم دادا سے زیادہ نہیں تھا۔ کہ آج تو نے مجھے کیسے دیا!

بھوپھی اور اس کے لڑکے کو بھی پتہ چلا۔ بھوپھی بولی کسی کو کچھ پاس ہو گئی ہوگی۔ آتی جاتی تو رہتی ہے۔ رقعے بازی بھی ہوتی رہتی ہے۔ اس کی اس بات نے میرا دل جلا کر رکھ کر دیا۔ آج اتنی بھی بہت خوش رات گئے جب سب سو گئے۔

نیلے آسمان کی تاروں سے بھری ہوئی چھت کے نیچے جب ہم سب لوگ لیٹے اور صرف میں اور اتنی جاگتی رہ گئیں۔ تو اتنی نے کہا:

بیٹی! اب میں چاہتی ہوں کہ میرے جیتے جی تیری شادی ہو جائے۔ تم نے میرا حال دیکھا ہے۔ دن بدن موت کے قریب ہوتی جا رہی ہوں اور پھر رشتہ دار بھی طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ تمہیں پتہ ہے۔ ہمارے خاندان میں کوئی پڑھا لکھا شخص تو ہے نہیں تو زیادہ پڑھ گئی ہے تو شادی کے لئے مشکل ہو جائے گی۔ ہم عزیز لوگ ہیں اور پھر ہمارے پاس اتنا پیسہ بھی نہیں ہے کہ تجھے آگے پڑھا سکیں۔

میں نے کہا۔ اتنی! مجھے تو ۲۵ روپے ماہوار وظیفہ بھی ملے گا۔ فیس کی اب کوئی فکر نہیں وہ معاف ہو جائے گی۔ اور ۲۵ روپے ہر مہینے مفت ملا کریں گے۔

اچھا ہاں! میں نے ابھی شادی نہیں کرنی۔ میں جب تک کوئی اچھا لڑکا نہ ہوگا شادی نہیں کروں گی۔

اتنی کہنے لگی۔ اس پھوپھی کے لڑکے سے تو تیری شادی نہیں ہونے دوں گی۔ مگر خالہ زینب کا لڑکا جو بینک میں نوکر ہے۔ میٹرک پاس ہے اور دو سو روپیہ تنخواہ لیتا ہے وہ بڑا نیک لڑکا ہے۔ میں چاہتی ہوں وہاں تیری شادی کروں۔ شادی کے بعد تم بیشک آگے پڑھ لینا۔

میں نے کہا۔ اچھا اتنی! شادی کر لوں گی۔ مگر یہاں نہیں۔ میں اپنی مرضی آٹھ روز کے بعد بتاؤں گی۔

اور اتنی مطمئن ہو کر سو گئیں۔

میں اندر ہی اندر سنہتی رہی۔ بھلا میں اتنی کو خود ہی کیسے بتا دیتی۔ اتنی کو پتہ چل جائے گا۔ کل یا رسول تک آسیہ کی اتنی ضرور آئیں گے۔

کیسے وہ ہمارا عزیز سا گھر دیکھ کر برا نہ منائے۔ اگر کہیں ایسا ہو گیا تو۔

مگر نہ جانے ایسے منحوس خیال کیوں میرے دل میں آنے لگ جاتے ہیں۔ توبہ! بھلا اختر! بات اس کی اتنی کبھی ٹال سکتی ہیں! کبھی نہیں۔

اور یہی سوچتی ہوئی مجھے نیند سی آنے لگی..... اس وقت رات کے ۹ بج چکے تھے دو کہیں ریڈیو پر فرائشی پروگرام نشر ہو رہا تھا..... ریکارڈ بچ رہا تھا۔

آئی۔ آئی شام سہانی

سن لے خوشی کی کہانی سن لے خوشی کی کہانی

بڑی سی پیاری ہوا چل رہی تھی..... موسم بڑا سہانا تھا..... اس موسم میں سکون کی نیند آنکھوں میں لیٹے خاموشی سے سو گئی..... کیونکہ سونے کے بعد میں نے بڑے پیار سے پیارے خواب دیکھے تھے۔

آج میں آسیہ کے مال گئی۔ پتہ چلا کہ اختر آسیہ کو لینے کراچی گیا ہوا ہے۔ یہ سن کر میری جان میں جان آگئی۔ اور میں خوش ہو گئی۔ اس کی اتنی کہتی ہوگی۔ میں اکیلے کیسے جاؤں! آسیہ کو لے آؤ اکٹھے جائیں گے۔ ایک دو روز تک اختر ضرور آجائے گا۔

میں لیٹ فیس دے کر کالنج میں داخل ہو جاؤں گی۔ پھر میں گھر آگئی۔ اور مطمئن ہو گئی۔

چھ روز ہو گئے ہیں۔ مگر اختر نے ابھی تک اپنی والدہ کو نہیں بھیجا۔ نہ جانے کیا باز ہو گئی ہے! کیا آسیہ کے فیمل ہونے کا اسے صدمہ ہوا ہے!..... کیا اس کی اتنی پیارا گئی ہے! نہ جانے کیا بات ہوئی ہے! اختر نے بھیجنے کا پکا وعدہ کیا تھا۔ اختر جھوٹ نہیں بول سکتا۔

داخلے بند ہو چکے ہیں مگر اختر ابھی تک نہیں آیا۔ اسے گئے ۲۰ روز ہو گئے ہیں۔ اختر کیوں نہیں آیا؟ اختر کہیں بیمار تو نہیں ہو گیا؟

اچھے خدا! اختر کو بہت جلد واپس لے آ۔

یا خدا! میری دعا سن لے.....

پھر کیا ہوا؟ خیریت تو ہے نا! اچھا کل داوا جان کام پر جائیں گے۔ تو جا کر پتہ لوں گی۔ کیونکہ ایک در درز تک پھر داخلے بند ہو جائیں گے۔

اختر ابھی تک نہیں آیا۔ چار روز اور بیت گئے ہیں۔ کل میں ضرور اس کے گھر جا کر پتہ کر دوں گی.....

دسم کس قدر برا آگیا ہے اگر میوں کا موسم مجھے بہت نہ ہر گتا ہے
 بہت دکھ دیتا ہے۔ ہمارے پاس نہ بجلی کا پنکھا ہے۔ نہ خنک ٹیٹیاں۔
 یا خدا! یہ گرمیوں کا موسم کیسے بیٹے کا جانچ گرمیوں کی چھٹیوں کے لیے بند
 چکا ہے۔ دادا جان کی کس قدر منتیں نہیں کیں۔ مگر وہ نہ مانے۔ دادا جان
 کبھی نہ مانیں گے۔

کالچ اب ستمبر میں کھلے گا۔
 ہائے! مجھے پڑھنے کا کس قدر شوق ہے۔ تو پھر کیا کروں گی۔ لیکن نہیں
 میں ضرور داخل ہوں گی۔ چاہے کچھ ہو جائے۔ ضرور داخل ہوں گی۔
 اختر! تم کہاں چلے گئے ہو تمہ نے کچھ بتایا بھی نہیں۔ اور چلے گئے ہو۔
 کتنا اچھا ہو۔ جو میں کل گھر میں داخل ہوں اور تم آ جاؤ۔
 کیا تم مجھے کل ملو گے نا! اچھا لوگ کہتے ہیں کہ سچے دل ضرور ملے
 میں دیکھوں گی تم مجھے ملتے ہو یا نہیں۔

میں حیران ہو گئی۔ آسیہ نے یہ بات کس جذبے کے تحت کی ہے۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔
 اس کے بعد اختر بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ سفر کی باتیں۔ ادھر ادھر کی باتیں۔ پھر بار بار
 مگر شادی اور کالچ کی کوئی بات اس نے نہ کی۔ میں نے بھی بات کرنی مناسب نہ
 سمجھی اور آ گئی۔ میرا دل بہت اداس اور پریشان تھا۔

اختر نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں ہفتے میں ایک روز اسے ضرور ملنے آؤں
 پھر وہ مجھے بہت سی باتیں بتائے گا۔

گھر آن کر میں نے اتنی کو آسیہ کا بتایا کہ وہ گر پڑی ہے اتنی نے بھی بہت افسوس کا اظہار کیا
 اتنی بازار سے کپڑا خرید کر لاتی تھی۔

ہاں۔ تو کیا تمہیں شک ہے !
نہیں۔ بالکل نہیں۔ آپ نے روزانہ آنے کو ٹھیک ہی تو کہا ہے۔

اچھا آئیہ کا حال بتائیں۔ وہ کیسی ہے !
اب تو بالکل ٹھیک ہو گئی ہے۔

اور یہ سامان کیا باندھا جا رہا ہے ؟ کہاں بھاگنے کا ارادہ ہے !

بھاگنا کہاں ہے ؟ کوہ مری جا رہا ہوں۔ یہاں گرمی میں نہیں رہا جاتا۔ . .
تمہیں واپس آنے کا ارادہ ہے۔ چلو گی تم بھی ساتھ !
میرا دل بھرا آیا تھا۔ . . اور میں بولی نہ سکتی تھی۔ میں نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ اور خاموشی
سے زمین کو تکتے لگی۔

بولو کیا چلو گی میرے ساتھ ؟

نہیں۔

کیوں ؟

میری مرضی !

کیا مجھ سے خفا ہو ؟

لڑائی کب ہوئی تھی ؟

نظر تو ایسا ہی آتا ہے۔

نظر تو ویسا ہی آسکتا ہے۔

یہ آج تمہیں ہو کیا گیا ہے ؟

مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا۔

پھر آخر اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔ اور ہاتھ سے میرا چہرہ پکڑ کر ادھر کرنے لگا میں
نے کہا۔

مجھے نہ ہاتھ لگانا۔

پھر میں نے بیٹھ کر شام تک سیر اور انجم کی قمیضیں تیار کیں۔ میں اپنے خیالوں میں اور غرق
کے سینے میں اس قدر محو ہوئی کہ مجھے شام ہونے کا پتہ ہی نہ چلا۔
دو دونوں کے لیے ساتھ کی ہمسائی سے مشین مانگی ہوئی ہے۔ کل اور پرسوں دونوں دن بڑے
کمر سارے کپڑے تیار کرنے میں گرمیوں میں موٹے کپڑے نہیں پہنے جاتے۔

پندرہ روز گزر گئے ہیں آئیہ کے ہاں نہیں گئی۔ حالانکہ اختر نے ہر ہفتے آنے کا
ہوا تھا۔ میرا دل کتنا تلگین اور اداس ہے۔ دادا جان ستمبر کے مہینے میں میری شادی کا
چاہتے ہیں۔

نہ جانے کیا ہونے والا ہے کیا اختر کو اس چیز کا خیال نہیں ہے میں اختر کو ساری
بتا چکی ہیں۔ اب بار بار کیا بتاؤں !
اچھا کل آخری بار اسے جا کر ضرور کہوں گی۔ کہ ستمبر میں میری شادی ہو رہی ہے

آج میں اختر کے ہاں گئی گئی تو وہ سامان باندھنے میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھ
اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میرا دل دکھ سا گیا۔ میں چند منٹ کھڑے
اور پھر واپس آنے لگی تو اس نے آواز دے کر بٹھرایا۔

کنے لگا۔ میں تم سے خفا ہوں۔ تم اتنے روز کیوں نہیں آئیں ؟ میں تمہیں رو
یا کر رہا تھا۔ روز تمہارا انتظار کرتا تھا۔ مگر تم کس قدر ظالم اور بے وفا ہو۔ میں نے کہا
اور بے وفائی ہوں یا آپ !

کیوں میں کیسے ہوں ! میں اگر تمہارے گھر آسکتا تو تم دیکھتیں۔

کہ روزانہ آتا۔ بلکہ وہیں رہتا۔

اچھا۔

برسنے لگا تو میں جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ اور دیوار کے ساتھ منہ لگا کر سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ اور پھر اتنے آنسو بہے کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں۔ اختر بہتیرا چپ کرا رہا۔ مگر میرے آنسو تھکنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔

پھر اختر نے مجھے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔ اور خود بھی پاس ہی بیٹھ گیا۔ اور پوچھا بتاؤ۔ کیوں رو رہی ہو؟

مجھے کچھ نہیں ہوا اختر۔

تو تم مجھے بے وقوف بنانا چاہتی ہو۔

بلکہ یہ کہنا چاہیے۔ کہ اختر اب تم مجھے بے وقوف نہ بنا سکو گے۔ تم اچھا بھلا جانتے ہو اور پھر یہ کہتے ہو۔

بھئی زاہدہ! دیکھو۔ سیدھی سیدھی بات کرو۔ دیکھو میری طرف دیکھو۔

کیا تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں؟

نہیں بتاؤں گی۔

اچھا نہ بتاؤ۔ میں جانتا ہوں۔ تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔

تم غلط جانتے ہو۔ میں پیار نہیں کرتی۔

اچھا تو یوں کہہ لو کہ اختر تمہیں پیار کرتا ہے۔

ہاں اختر مجھے پیار کرتا ہے اور میں زاہدہ اختر کو پیار نہیں کرتی۔ اور اختر اس قدر پیار

نا ہے کہ اس کے پیار سے میری آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔ میں نا۔

تو کیا تمہیں شک ہے! اچھا لو۔ آؤ سارا غصہ تھک دو۔ بھلا جانے سے پہلے

بوسے کیوں خفا ہوتی ہو۔ کیا پتہ میں ہی مر جاؤں۔ اور واپس ہی نہ آؤں۔ پھر۔۔۔

ہر تو تم بہت خوش ہو گی۔

ہاں۔۔۔۔۔ خوش کیوں نہیں ہونا اختر!۔۔۔۔۔ تھا۔ یہ دیکھی کر دینے والی آتی

کبھی فراموش نہیں کروں گی۔

تو کیا تم کو میرے مرنے کا افسوس ہو گا۔

اختر نے ہنس کر کہا۔ کیوں؟ یہ کیا ہو گیا؟

مجھے ہاتھ لگانا اچھا نہیں۔۔۔۔۔

سیدھی طرح کیوں نہیں کہہ دیتیں۔ کہ تم اب اچھے نہیں لگتے اب کوئی اور اچھا لگتا ہو گا۔

میں تڑپ اٹھی۔ اور کہا۔ ایسی بات پھر کبھی نہ کہنا۔

یہ کوئی اتنی بری بات نہیں ہے۔

تمہارے لیے بالکل معمولی بات ہو گی۔ مگر میرے لیے یہ برائی کی آخری بات ہے

بھئی کمال ہے۔ تم بھی حد کرتی ہو۔ مذاق کی بات کو اتنا (SERIOUS) لے لیتی ہو۔

مذاق کا بھی کوئی وقت ہونا چاہیے۔

وقت تم بتا دو۔۔۔۔۔ میں نے تو یوں ہی بات کر دی تھی۔

اچھا تو میں چلتی ہوں۔

ابھی نہیں جا سکتیں۔

کیوں؟

بس۔ میری مرضی!

تم کون ہو؟

میں تمہارا اختر ہوں۔

تم میرے کچھ بھی نہیں لگتے۔

لیکن پیسے تو کچھ لگنا تھا۔

میں کچھ نہیں جانتی۔

مگر زاہدہ! تمہارا مزاج کیوں خراب ہو گیا ہے۔ بتاؤ نا۔ تمہیں کیا ہوا ہے؟

میں چند لمحے خاموش رہی۔ اور جب اس نے دوبارہ میرا چہرہ پکڑ کر ادھر کیا۔ تو میرا

تو کیا تم نہیں جانتے کہ مجھے افسوس ہوگا!

نہیں کا ہے کا افسوس ہوگا؟

اچھا نہیں ہوگا۔ نہیں ہوگا۔ اس بات کا تمہیں بہت جلد یقین آگیا ہوگا۔ میں نا۔

بس اس طرح بہت بحث ہوتی رہی۔ پھر میں خاموش ہو گئی۔ میں نے اسے ایک بار

بھی نہ کہا۔ کہ تم نے تو ہمارے گھر پیغام بھیجنا تھا اور یہ کہ میری شادی ستمبر میں ہو رہی ہے۔

اور تم ستمبر میں کوہ مری بیٹھے ہو گے۔ پھر میں نے کہا۔

اختر! کیا تم میری شادی پر آؤ گے!

تمہاری شادی پر نہیں آنا۔ تو اور کس کی شادی پر آنا ہے۔

اچھا!

کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟

ستمبر کے آخر میں۔

کالنج میں داخل نہیں ہوگا؟

نہیں دادا جان بالکل اجازت نہیں دیتے۔ وہ تو ایک جگہ بات چیت کو روک رہے ہیں۔

تو تم نے انہیں منع کیا ہوتا۔

میری بات بھلا کون سنتا ہے؟

اختر کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

میں نے اتنی سے بات کرنی تھی۔ مگر ان دنوں اتنی کاموڈ ٹھیک نہیں ہے۔ تم نا۔

نہ کر۔ ستمبر میں ان کو سارا کچھ ٹھیک کر لوں گا۔ پھر میں اتنی کو منالوں گا۔

میں خاموش رہی۔

پھر اختر کتنی ہی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا کبھی کانے لگ جاتا۔

چیزیں اکٹھی کرتا۔ کبھی مجھے پیار کرتا۔ بس یونہی وقت گزر گیا۔

پھر اختر نے خدا حافظ کہا۔ اور کہا کہ اچھا ہوا۔ جو تم آج آگئیں ورنہ میں نے دا۔

مہینوں کے بعد ملنا تھا۔

اور پھر میں آگئی۔ میں سارا راستہ روتی رہی۔ نہ جانے کیوں اس کے گھر سے

برکتے ہی میری آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ ابل پڑا۔۔۔۔۔ اور پھر آنسو رکنے

نام ہی نہ لے رہے تھے۔۔۔۔۔ بڑی مشکل سے میں نے گھر کے قریب پہنچ کر

بو خشک کیئے۔ گھر میں داخل ہوئی تو ڈیوڑھی کے پاس ہی چھوٹی کھڑی تھی۔ اس نے

مجھے گھور کر دیکھا۔ میں ادھر آگئی اور چپکے سے کوٹھے کی چھت پر جا کر لیٹ گئی۔

انے پوچھا۔ کیا ہوا تجھے!

میں نے آواز کو درست کر کے بڑی چپک کر کہا۔ جیسے بہت خوش ہوں۔ اتنی!

ٹھیک ہوں۔ کچھ نہیں ہوا۔ اور میں خاموشی سے دیوار سے ٹیک لگا کر چد پائی

بیٹھ گئی۔ اور سامنے خلاء کو گھورنے لگی۔ آج میرا دل کس قدر دیران تھا! یہ میں بنا۔

ہاں سکتی۔ میری زندگی کے چمن میں بہار آنے سے پہلے ہی رخصت ہو گئی۔ میری خوشی

پھول کھلتے سے پہلے ہی مرجھا گیا۔ مجھے اپنے چاروں طرف دیرانی ہی دیرانی نظر آئی۔ یہ

ہو گیا؟

وہ کیسی صبح ہوئی تھی۔ جس کی اتنی جلدی شام بھی ہو گئی!

وہ روشن دن کدھر گیا؟

کیا ہونا تھا۔ اور کیا ہو گیا؟

اختر نے تو کوئی بھی پردہ نہیں کی۔ اختر نے تو وہ جوش و خروش دکھایا ہی نہیں۔ جس

اس نے شروع میں یقین دلایا تھا۔

اب کیا ہوگا؟

اختر جا رہا ہے۔

کل وہ کوہ مری پہنچ جائے گا خوبصورت اور سرد پہاڑوں پر وہ کل کی رات سکھ اور

یہاں سے سوئے گا۔۔۔۔۔ مگر مجھے کیسے نیند آئے گی!

میں اختر کو جانے سے کیسے روکوں؟

میں نے تو اسے ایک بار بھی نہ روکا شاید وہ رک جاتا لیکن شاید وہ نہ ہی رکتا۔ لیکن میں اسے ایک بار تو کم لیتی۔ شاید وہ نہ ہی جاتا۔
اختر! مت جاؤ میں یہاں تین مہینے کیسے گزاروں گی اگر جانا ہی ہے تو پھر مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ اختر! میں کیسے زندگی کے دن گزاروں گی۔ اور پھر میں پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ شام ہوتی گئی۔

بڑھتی جا رہی ہے
ڈاکٹر نے کام کرنے کو بالکل منع کیا ہوا ہے۔ مگر پھر بھی کرتی ہیں۔
میری امی! میں کل سے تمہیں کوئی کام نہ کرنے دوں گی۔ میں سارا کام خود کروں گی۔
میری امی! تم نہیں جانتیں مگر تمہیں کیا معلوم کہ تمہاری زاہدہ اس وقت ہی آزرہ بیٹھی ہے۔

لیکن کیا پتہ۔ اختر ستمبر میں کوشش کر ہی دے۔ آتی دفعہ اس نے مجھے کتنی زیادہ پی نہیں دی تھی۔ میں ہی پاگل ہوں جو یوں سوچتی ہوں۔ میں تو خواہ مخواہ رونے لگ جاتی تھی۔ اب نہیں روؤں گی۔ اوستہ کا انتہائی صبر اور حوصلے سے انتظار کروں گی۔
دادا جان شادی کی بات پکی کر ہی گئے۔ تو میں اسے کسی نہ کسی طرح ٹال دوں گی۔
اچھے خدا! تم میری مدد کرنا۔ ضرور کرنا۔

اندھیرے کا سورج ہر چیز کو بے کمر ڈوب گیا۔
میں بالکل بے حس و حرکت اور لٹی رہی۔
پھر امی نے بہت آوازیں دیں۔ تو اٹھ کر بیٹھے آئی اپنا چہرہ چھپاتی رہی اپنا دکھ چھپاتی رہی۔ کس کو سناتی؟ یہ دکھ کس نے دیا نہیں۔ خود ہی مول لیا۔ اس دکھ کو کیسے بتاتی؟ اس دکھ کا کیا نام تھا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی تھی۔ روشنی کی طرف سے پیٹھ کر کے اندھیرے کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔

ہنسی مذاق کی باتوں پر بے تحاشا ہنستی رہی۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے آنسو بھی پونچھتی جاتی تھی۔

دن گزر رہے ہیں۔ صبح ہوتی ہے اور شام ہو جاتی ہے۔ رات ہوتی ہے پھر صبح ہو جاتی ہے۔ کئی روز گزر گئے ہیں۔ اختر کو چھپس روز ہو گئے ہیں۔ اس نے کوئی خط بھی نہیں لکھا۔ مگر وہ لکھ بھی کیسے سکتا تھا! ہمارے گھر میں تو خط آپسی لاسکتا۔ اگر کوئی ڈاک یا میرے نام کا خط لے کر آجائے۔ چاہے وہ میری کسی سہیلی نے لکھا ہو۔ تو میری خوشامنت ہی آجائے دادا جان یہ کبھی پسند نہیں کرتے کہ میں کسی سہیلی سے ملوں۔ یا خط و کتابت کروں۔ اور پھر ہمسائے بھی تو طرح طرح باتیں کرتے ہیں۔

ہمارے گھروں میں یہ کسی بری عادتیں ہیں۔ لیکن ان کو کیسے دور کروں یہاں اور دو رنگ جاہل لوگ رہتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑتے ہیں۔ کل شمیم کی والدہ شمیم کی دادی میں بہو اور ساس میں جھگڑا شروع ہوا۔ تو اس جھگڑے کے شعلے تین

آج میں ان لوگوں کے درمیان بے آس دل اور ویران چہرہ بیٹھے بیٹھی۔ میرا دل دکھ گیا تھا۔ مگر کسی کو علم نہیں۔

سامنے دادا جان بیٹھے اپنے کاغذوں کو دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے الماری کھلا ہوئی ہے اور چہرے کے ساتھ کاغذوں کو لگائے پڑھ رہے ہیں۔
نسیم نزل سے پانی لا کر حمام کو بھر رہی ہے۔ انجم بازار سے کچھ خریدنے گیا ہوا ہے والدہ باورچی خانے میں بیٹھی آٹا گوندھ رہی ہیں۔

میری امی کتنی کمزور ہو گئی ہیں۔
ان کا رنگ کتنا زرد ہوتا جا رہا ہے۔
پتہ نہیں ان کو کیا ہو گیا ہے! آبا کے مرنے کے بعد سے تو ان کی حالت دنیا بھر

اختر کو تین خط ڈال چکی ہوں۔ آج اختر کو گئے درہمیں ہو گئے ہیں۔
۱۵ ستمبر تک اس نے آنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ ۲۰ روز باقی رہ گئے ہیں۔
یا خدا! یہ بھی جلدی گزر جائیں تو اچھا ہے۔ اختر نے تصویر دینے کا وعدہ
کیا تھا۔ وہ بھی نہیں دی۔ اچھا دن گزر رہی جائیں گے۔ کسی نہ کسی طرح۔

اور گھروں تک بھی جا پہنچے۔ اور پھر باقاعدہ ایک لڑائی شروع ہو گئی۔
ایک کچے تھے بات کرتے بھی شرم نہیں آتی۔ تیری بیٹی کو کسی کنواری بیاسی لگی
تھی۔ حرام کا لڑکا پیدا کر کے ہی سسرال پہنچی تھی۔ پھر بھی تو گریبان میں منہ ڈال کر نہیں دیکھتی
اور وہ کبھی تیری منور بھی ایک نہیں لٹی حرام کے بچے پیدا کرے گی۔ روزہ یاد سے ملنے جاتی
ہے اچھی طرح تیری ناک کاٹے گی۔

یا خدا!..... ایسی ایسی نخس باتیں کر رہی تھیں کہ سنی نہیں جا رہی تھیں۔

اور مال یہ سن کر منور کو پیٹ رہی تھی۔ کو نامراد! نہ تو پیدا ہوتی نہ تیرے یاد کا طعنہ
مجھے ملتا۔

اختر کو میں چھ خط لکھ کر ڈال چکی ہوں۔ لیکن یہ نہیں ستہ کہ اسے ملتے بھی
میں۔ یا نہیں۔ اب یہ تو اس کے آنے پر پتہ چلے گا۔ اس نے آنے میں اب کون
سے دن رہ گئے ہیں۔ صرف چار دن باقی رہ گئے ہیں۔

نہ جانے اختر اب کیسا ہو گا؟..... ضرور موٹا ہو گیا ہو گا!
ہم تو اس سڑی گرمی میں کس مشکل سے دن گزارتے رہے ہیں۔ اس دفعہ تو
برسات بھی نہیں ہوئی۔ گرمیوں کا یہ موسم کتنا برا موسم ہے۔ کل رات کس قدر آندھی
آئی تھی۔ دنیا میں سب سے زیادہ اگر مجھے کوئی چیز بری لگتی ہے۔ تو وہ صرف
آندھی ہی ہے۔ آندھی چل رہی ہو تو کو کھٹوں پر سے چیزیں اتارتے ہوئے لوگ
بھوت لگتے ہیں۔ آندھی ہر چیز کو خاک میں ملا کر رکھ دیتی ہے۔ کہتے ہیں جس چیز سے
انسان کو نفرت ہو۔ اکثر وہی چیز اس کا مقدر بن جاتی ہے.....
آندھی سے مجھے نفرت ہے۔

کہیں میری زندگی میں بھی کوئی ایسی آندھی نہ چل جائے۔ جو میری زندگی، میری
روزانہ اور میری جوانی کو خاک میں ملا کر رکھ دے!
یا خدا! ایسا کبھی نہ کرنا۔ کبھی نہ کرنا۔

یہاں تو روزانہ ہی کچھ ہوتا ہے۔ روز جھگڑے ہوتے ہیں۔ چغٹی ہیں۔ چلاتی ہیں
رات کو خادند اور بیٹے گھر آتے ہیں تو رو رو کر ان کو سناتی ہیں۔..... پھر اس نے جس جبر
کو ڈانٹنا ہوتا ہے۔ ڈانٹتا ہے۔ اور رات گئے تک بڑبڑ ہوتی رہتی ہے۔ صبح کو پھر دم
سلسلہ چلتا ہے۔

میں ایسی باتیں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی رہتی ہوں کہ یہ دنیا میں کا ہے کے لیے آئی
دنیا میں آنے کا ان کا مقصد کیا ہے۔
یا خدا! تو مجھے اس ماحول سے کب نکالے گا۔ میرے لیے یہ ماحول اتنا اجنبی
ہے۔ کب تک اجنبی رہے گا۔!!

آج میں اختر کو خط لکھوں گی۔ مگر پوسٹ کیسے کر دوں گی۔!!
اچھا کل انجم کے ساتھ بازار چلوں گی۔ تو راستے میں پوسٹ کر دوں گی۔ خدا کرے!
خط اختر کو مل جائے۔ ایڈریس تو اس نے ٹھیک ہی دیا ہو گا۔
آج کسی وقت اطمینان سے بیٹھ کر خط لکھوں گی۔ سب سے چھپ کر۔ اور
کہیں دادا جان کو پتہ چل جائے۔ تو گھر کو آگ ہی لگا دیں گے۔

میں اختر کو بتاؤں گی کہ میں اسے کتنا زیادہ یاد نہیں کرتی میں اس کے بغیر زندہ نہیں
رہ سکتی اور اسے کہوں گی کہ تم جلدی جلدی آ جاؤ۔

۳ج وہ لوگ شادی کا رشتہ لے کر ہمارے گھر آئے تھے۔ وہی لوگ جہاں پر دادا جان شادی کرنا چاہتے ہیں۔ دادا جان نے کہا ہے میں ایک ماہ کے بعد تباؤں لاکر میں زائبرہ کی شادی کروں گا۔۔۔۔۔ یا نہیں۔۔۔۔۔

ان عورتوں نے مجھے بھی دیکھا۔ ان کا خیال ہو گا شاید میں شراڈں گی۔۔۔۔۔ اور مسکراؤں گی اور گھونگھٹ نکال لوں گی۔

لیکن میں خاموش۔ اداس اور زرد چہرہ لیے ان کے سامنے چپ چاپ بیٹھی رہی۔

... میں ان کو کیا کہتی!!
کتنی موٹی۔ بے ڈھنگی عورتیں آئیں تھیں!۔۔۔۔۔ ایک نے اگر کس کر چٹیا کی ہوئی تھی تو دوسری نے یوں جھوٹا کیا ہوا تھا۔ جیسے کیلوں سے ٹنگا ہوتا ہے۔ سروں پر بے تحاشا تیل لگایا ہوا تھا۔۔۔۔۔ ایک نے گلانی شلوار۔ فیروزی قمیض اور کیسری دوپٹہ لیا ہوا تھا۔ دوسرا نے مونیکا رنگ کا سوٹ اور سرخ رنگ کا دوپٹہ۔

واہ! واہ! کیا میچ کیا ہوا تھا! سبحان اللہ۔۔۔۔۔ جن کو رنگوں کا سیٹ نہ تھا۔ ان کے دماغ میں تو گھاس بھی نہیں کیا بھرا ہو گا۔۔۔۔۔

کیا میں ان لوگوں کے درمیان رہ سکتی ہوں!۔۔۔۔۔ نہیں نہیں کبھی نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں زہر کھا لوں گی۔ خودکشی کروں گی۔ مگر یہ شادی نہ کروں گی۔

ان کے جانے کے بعد میں نے اتنی سے کہا۔۔۔۔۔ اتنی!
یہ کس چڑیا گھر جانور آئے تھے!!۔۔۔۔۔ کس میلے میں گھومنے گئے تھے۔

کئی روز سے ڈائری نہیں لکھ سکی۔ بہت بخار آتا رہا۔۔۔۔۔ رات سردی بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ آسمان سے ساری رات شبنم گرتی رہتی ہے۔ اور میں معمولی سی چادر اوڑھ کر سوتی رہتی ہوں۔ جس سے سردی مگر کربخار ہو گیا ہے۔

اختر ابھی تک کوہ مری سے نہیں آیا۔۔۔۔۔ اکتوبر کا مہینہ شروع ہو گیا ہے۔ خدا جانے اب وہ واپس بھی آئے گا یا نہیں۔

دادا جان نے کالج داخل نہیں ہونے دیا۔۔۔۔۔ سارا سارا وقت دوتی ہوں۔ زندگی میں کیا دلچسپی رہ گئی ہے۔ لیکن دلچسپی پیدا ہی کب ہوئی تھی؟ دلچسپی کے بغیر زندگی نہیں گزر سکتی۔ ہماری زندگی تو ایک دیران اور کالی رات ہے جس میں چند لمحے کو جگمگائے تھے۔ اور خدا جانے رات کو اسی تاریکی میں وہ کہاں کھو گئے ہیں۔ آسمانوں کی سمت اڑ گئے ہیں؟

میری ساری سہیلیاں کالج میں داخل ہو گئی ہیں۔ زندگی ان کے لیے ایک ایسا ہے۔ جسے بہار اپنے دامن میں پروان چڑھا رہی ہے۔ مگر میرے لیے زندگی ایک دیران باغ ہے۔ ہر درخت پتوں سے خالی ہے۔۔۔۔۔ شاید کبھی یہاں بہار آجائے!

اتنی بان کو کہنا یہاں کبھی نہ آئیں۔ اور اتنی سنیں دیں کہ سچی بات تو تو یہی مذاق کیا ہے۔
 بے بات تو پڑھ کھ گئی ہے۔ مگر ان کو تو کہیں اسکول میں نہیں پڑھایا گیا نا یہ بچہ سیدھی
 سادھی ہیں۔

تو اتنی بان سیدھی سادھیوں کو پھر سیدھے سادھے گھر میں جانا چاہیے۔ اس نے
 داد ا جان آگے اور میں خاموش ہو گئی۔

بار بار نہیں شے گا؛

اختر کس قدر موٹا اور سرخ ہو رہا تھا اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ نشی
 ہو گئی ہیں جب وہ میری طرف پیار سے دیکھتا ہے تو میری دینا ڈولنے لگتی ہے
 مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہنے لگا تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم اتنی کمزور اور زرد سی نظر آ رہی
 ہو۔ میں نے پرسن کر دنا شروع کر دیا۔ میں اسے کیا کہتی !!

میں اسے کیا بتاتی کہ تیری جدائی نے میرا یہ حال کر دیا ہے۔ یہ صرف تیری
 ہی جدائی ہوگی۔ جو مجھے موت سے ہم آغوش کرے گی۔ اور تیرا ہی ملاپ ہوگا۔ جو مجھے زندگی
 بخشنے گا۔

پھر میں اور اختر بہت دیر باتیں کرتے رہے اختر اپنی سیر کے واقعات سنا رہا . . .
 کہنے لگا۔ وہاں مال روڈ پر شام کو اس قدر رونق ہوتی ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔
 اس دفعہ کوہ مری اتنی خوبصورت خوبصورت لڑکیوں سے بھری ہوئی تھی۔ کہ میں بتا
 نہیں سکتا۔

اس کی یہ بات سن کر نہ جانے کیوں میرا دل اداس ہو گیا
 اختر کو کسی اور لڑکی کا ذکر کرنے یا اسے خوبصورت کہنے کا کیا حق حاصل ہے؛ مگر
 اس کی خاموش رہی۔

پھر وہ کہنے لگی۔ ایک لڑکی ذرینہ جو زانہ مجھے وہاں مال روڈ پر سیر کرتی مل جاتی تھی اور
 پھر وہ مجھ سے باتیں بھی کرنے لگی۔ بہاد نے گھر بھی آنے جانے لگی۔

مگر میں نے اس کی کبھی پرواہ نہ کی۔ میں تو صرف نہیں یاد کرتا رہا۔ صرف نہیں کہ اگر
 ابھی یہاں ہوتیں۔ میرے ساتھ پہاڑ پر آئی ہوتیں۔ تو ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سیر
 کرتے۔ پھر کتنا مزہ آتا۔

اور میرا دل جو ذرینہ کی بات سن کر بھڑک رہا تھا۔ پھر سے چمک اٹھا۔ اور میں بہت
 ڈن ہو گئی۔ اختر پر مجھے پورا یقین ہو گیا
 پورا پورا یقین۔ کہ وہ مجھے بے انتہا چاہتا ہے۔

آج کا دن میری زندگی میں خوب صورت ترین دن طلوع ہوا تھا آج کی صبح کتنی حسین
 تھی! آج کی صبح نے اس تمام سے آسمان کے مشرقی کناروں سے اپنا چہرہ ادھر اٹھایا کہ یوں لگا
 تھا جیسے ایک نہیں دو سو دن طلوع ہوئے ہیں۔ آج اختر کوہ مری سے واپس آ گیا تھا۔ اور
 آتے ہی اس نے کہلا بھیجا تھا کہ جس طرح بھی ہو تم ابھی ملنے آؤ۔ میں تمہارے بغیر بہت اداس
 ہوں۔ آج میں کتنی خوش تھی!

میرے انگ انگ سے خوشی پھوٹی پڑتی تھی۔
 کاش! آج کا دن ہمیشہ میری زندگی پر چھایا رہتا۔ آج کے دن کی شام کبھی نہ ہوتی۔
 آج کا دن اتنی جلدی کیوں غروب ہو گیا!
 اے! اجب آج میں اختر سے ملی۔ تو میرے لیے وہ کچھ کس قدر سہانا
 کیسا لافانی! اور کیا انمول لمحہ نہ تھا۔

اے زندگی کے حسین ترین لمحے! تو کب سے میری انتظار میں بیٹھا تھا! کیا تو مجھے

میں نے اختر سے کہا۔ اگر تم چاہتے۔ تو تم مجھے ساتھ لے جاسکتے تھے۔

وہ کیسے زاہدہ؟

کیا تم نہیں سمجھتے؟

اچھا تو پھر سہی!

اچھا۔ تو پھر اگلے سال سہی۔ یہی ترکیب پھر بھی چل سکتی ہے۔ پھر میں نے بھی اختر کو اپنی باتیں بتائیں۔ کہ اس کے بغیر میری زندگی کے دن کیسے گزرے۔ اسے بتاتے وقت میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور اختر کہنے لگا۔

تم بالکل بچہ ہو۔ ذرہ ذرہ سی بات پر رونے لگ جاتی ہو!

پھر اختر نے پوچھا۔ کالج داخل ہوگئی ہو؟

میں نے کہا۔ بالکل نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ اور نہ ہو سکتی ہوں۔ دادا جان تو لگا

ماہ میری شادی کر رہے ہیں۔

اختر نے بڑے آنسوؤں کا اظہار کیا۔ مگر وعدہ کیا کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور مدد کرے گا۔ اس نے بتایا کہ وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور یہ کہ اس نے مجھے اپنے سینے کے ساتھ لگایا۔ اس کے سینے کے ساتھ گتے ہی میں نے آنکھیں بند کر لیں اور مجھے یوں لگا جیسے میں جادو کی مدد سے جنت میں داخل ہوگئی ہوں۔ اس کے چوڑے سینے پر سر رکھ کر میں زندگی بھر تک سوئی رہنا چاہتی تھی۔

اس کے گریبان کے پاس سے بہت اعلیٰ سینٹ کی خوشبو آرہی تھی پچ

اختر مجھے بہت پیار کرتا رہا۔۔۔۔۔

لیکن بابا بار ایک خیال آتا تھا کہ جہاں جدائی نے مجھے اداس اور زرد کر دیا،

وہاں اختر کو جدائی نے کتنا سرخ اور موٹا کر دیا تھا۔

کیا اختر کو جدائی راس آگئی تھی؟۔۔۔۔۔

مگر نہیں نہیں۔۔۔۔۔

مجھے ایسے شک اور دہم کو قریب بھی نہیں پھکنے دینا چاہیے۔ یہ دہم!

شک محبت کو قتل کر دیتے ہیں۔

میں نے شروع دن سے ہی اس کی بات پر یقین کر لیا تھا اور ہمیشہ اس کی باتوں پر ایمان لاؤں گی۔ وہ کبھی جھوٹا اختر ثابت نہیں ہوگا۔

گھر آتے ہی دادا جان سے جھڑکیاں پڑیں مگر آج ان کی جھڑکیوں کی کون پر وہ کرتا تھا۔

آج میری پرانی سہیلی نجمہ نے مجھے خط لکھا۔ نجمہ کتنی مہربان اور چٹھی لڑکی ہے! اور خط کے ساتھ اس نے مجھے ایک جوڑا بھی بھیجا ہے۔ میں لینا نہیں چاہتی تھی۔ مگر اس نے کتنے پیار اور اصرار سے بھیجا تھا!۔۔۔۔۔ جوڑا کتنا پیارا ہے! آئی کہتی ہے۔ جہیز کے لیے رہنے دو۔ مگر میں تو اسے پہن لوں گی۔

میں اسے پہن کر اختر کے پاس جاؤں گی۔۔۔۔۔ آئیہ کراچی سے آئی اسی نہیں، بلکہ وہاں سے کوٹہ چلی گئی تھی۔ اور اب وہ سکول بھی نہیں آئے گی۔ لیکن مجھے اب سکول سے کیا۔

لیکن آج دادا جان سے کہوں گی۔ رات رو رو کر ان کو مناؤں گی کہ مجھے کالج میں داخل کرا دیں۔ اختر نے تو کوئی بھی نہیں کہلا بھیجا۔

وہ بچا راکھے بھی کیسے؟ دادا جان تو ایک پل میں عزت اتار کر رکھ دیتے ہیں۔

پھر کیا ہوا۔ اگر اختر نے وعدہ کرنے کے باوجود کسی کو نہیں بھیجا میں اس سے

بات پر کبھی خفا نہیں ہوں گی۔ اختر جو کچھ بھی ہے اچھا ہے یا بُرا۔ اب تو میرے

خوشی میری زندگی کا خون اور میرے سر کا تاج ہے۔ اگر وہ مجھ سے پیار کرتا ہے

میرے لیے یہ سارا کچھ ہے۔ اور وہ یقیناً مجھ سے پیار کرتا ہے۔

پھر میری زندگی کے سارے گیت ختم ہو جائیں گے۔ ہر آواز خاموش ہو جائے گی۔
میرے آسمان پر سے ہر تارا ٹوٹ کر کہیں گم ہو جائے گا۔
اور سارا آسمان تاریک ہو جائے گا۔ میری دنیا اندھیری ہو جائے گی۔ نہ کوئی سوز
چلے گا۔ اور نہ کوئی چاند مسکرائے گا۔
میں بس سارا کچھ بتا دوں گی۔ ضرور بتا دوں گی۔

ایک ماہ گزر گیا ہے۔ دادا جان نے میری دماغی بات سنی کر دی ہے۔ اور کہا
ہے کہ شادی بھی جلدی کر دیں گے۔

مائے! میں کیا کروں گی۔ میں نے تین روز سے روٹی بھی نہیں کھائی۔ بھوک بڑھنا
شروع کی ہوئی ہے۔ دو روکر پاگل ہو رہی ہوں مگر میری بات کوئی نہیں مانتا۔ اتنی
خاموش ہیں۔ اتنی کوکیا پتہ کہ یہ شادی نہیں بلکہ اس کی بیٹی کی موت ہوگی۔ دادا جان بھی نہیں
سن رہے۔
وہ تو بالکل ہی پاگل ہو گئے ہیں۔ کیا انہوں نے اپنی شادی کرنی ہے یا خا ہے؟

میری مدد کرنا۔ میں تو نہ راتوں کو سو سکی ہوں نہ کچھ کھا رہا ہے۔
مائے! میں کیا کروں گی!
اختر کو بھی کچھ خیال نہیں ہے!

میں ایک دو روز تک اختر کو جا کر ضرور کہوں گی۔ ضرور کہوں گی کہ کیا وہ میرا
ساتھ فریب تو نہیں کر رہا! میرے دل میں شک آرہے ہیں۔
لیکن نہیں جب تک اس کو دیکھ نہ لوں گی۔ شک کو پاس نہ آنے دوں گی۔ میں
سے آخری بات پوچھ کر آؤں گی۔

مائے! مجھے بار بار شادی لگاتے ہوئے شرم بھی آتی ہے مگر اختر کو کوئی خیال
ہے۔ اچھا۔ میں اب بالکل آخری دفعہ اختر سے کہوں گی۔ کہ اگر اب اس نے اپنی کوئی
نہ کی تو پھر میں اس سے ملنے کبھی نہ آسکوں گی۔

اور دادا جان نے تو مجھے اتنا مارا ہے اور گالیاں دی ہیں کہ بتا نہیں سکتی۔ نہ دو روز سے
غریب کچھ کھا ہے۔ دادا جان کہتے ہیں۔ اس کی ڈولی یا جنازہ گھر سے نکال کر ہی اب یہاں چلا
آکر کروں گا۔ میرے خدا! یہ کیا ہو گیا ہے! مگر یہ بتایا کس نے ہے۔

کی اختر کے گھر والوں میں سے کسی نے بتایا ہے! لیکن اور کون بتا سکتا ہے! اور تو کسی علم نہیں! مجھے جس بات کا ڈر تھا۔ وہ ہو گیا ہے۔
اب کیا ہو گیا۔

اختر! کیا تمہارے گھر والے اس قدر بے رحم اور ظالم ہیں! میں نے انکا کیا بگاڑا تھا!.....
اختر! میں نے تو تم سے بھی کچھ نہیں چاہا تھا..... تم سے صرف محبت ہی کی تھی نا.....
اس ایک سال کے عرصہ میں صرف تم سے محبت ہی کی ہے نا..... اور تو تم سے کچھ نہیں پایا۔ میں نے تم سے کچھ لیا تو نہیں نا..... بلکہ دینا ہی چاہا ہے نا..... پھر الیا کیوں ہو گیا؟

کیا تم نہیں جانتے تھے کہ ہم لڑکیاں..... ہم جیسے ماحول کی لڑکیاں..... کسی سے یوں محبت نہیں کر سکتیں۔ وہ اگر کسی لڑکے سے محبت کرتی ہیں تو اسکو اپنا خاوند سمجھ کر کرتی ہیں ہم محبت کہیں اور شادی کہیں اور نہیں کر سکتیں۔
ہم محض دوستی رکھ سکتی ہیں..... پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں کہیں اور شادی کر لوں۔

میرا تو اب کسی اور شخص کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ میں تو پاگل ہو جاؤں گی۔

اختر! لو! میں کیا کر دوں گی! میں تمہیں کیسے بھلا دوں۔
تمہیں بھلا نا میرے اختیار سے باہر ہے۔

میں اب تو تمہیں مل بھی نہیں سکتی۔ ورنہ میں تمہیں سارا کچھ بتاتی۔ کاش! میری مہربان سیلا!
خجہ یہاں ہوتی۔ تو میں اسے سارا کچھ بتاتی۔ مگر وہ اتنی دوسریوں بیٹھی ہے۔
اب کیا ہوگا! سوچ سوچ کر میرا تو سر پھٹنے لگا ہے۔

زندگی دکھوں اور غموں سے بھری ہوئی ایک ایسی طویل اور سیاہ رات نظر آتی ہے۔ جس کی صبح قیامت تک بھی ہوتی نظر نہیں آتی.....
اس زندگی کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرتا۔ جو خوشی کا ہو..... بے وفا اختر! دو ماہ دگئے ہیں اس سے ملے ہوئے۔ مگر اس نے بھول کر بھی خبر نہیں لی..... مجھے کبھی خیال میں آیا تھا کہ اختر ایسا بھی بے وفا ہو سکتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اس کی باتوں پر یقین کیا تھا۔ جھوٹا نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن کیا پتہ۔ یہ اس ہی کی شرارت نہ ہو۔
وہ تو کہتا تھا میں تم سے محبت کرتا ہوں..... پھر وہ شرارت کیسے کر لیا تھا!.....

کل شام دادا جان گجرات جا رہے ہیں..... ان کے جانے کے بعد میں ایک رات خود بھی اختر سے ملوں گی۔ ضرور ملوں گی۔

پھر اس کے بعد جو ہوگا۔ دیکھا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ میں خود کشی کر لوں گی..... میں نیلا مٹو تھا کھالوں گی..... اور مر جاؤں گی۔ مجھ کو بھلا زندہ

لیکن میری بہن اور میرے بھائی اور میری ماں کا کیا بنے گا! میری ماں تو یہ صد نہ ہسمہ سکے گی۔؟ زندہ بھی نہیں رہ سکتی۔ چند ماہ تک میری شادی ہو جائے گی.....
اے! میں شادی کیسے کر سکتی ہوں! مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے جہاں یہ میری شادی اچلتے ہیں۔

اس کے پٹنے کی دیر تھی۔ کہ آنسوؤں کا سیلاب سارے بند توڑ کر بہہ نکلا۔ . . . اور پھر میں اس قدر روئی کہ اس کی قمیض گریبان کے پاس سے تڑ ہو گئی۔ اور وہ خاموش رہا۔ باہر سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ تو وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اور میں بھی درست ہڑکپیٹ گئی۔ آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ میں نے رومال سے خشک کر کے منہ پر لی طرف کر لیا۔ لیکن کوئی بھی ادھر نہ آیا۔ بلکہ سیدھا اوپر چڑھ گیا۔ آخر ترے اٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ اور پھر پاس کی کرسی پر آن بیٹھا۔

زاہدہ! کیا مجھ سے خفا ہو۔

میں خاموش رہی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں بات کیسے شروع کروں۔

میں پھر بھی خاموش رہی۔

کیا مجھ سے بولو لگی نہیں۔

میں پھر بھی چپ رہی۔

پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے جھنجھوڑا۔

زاہدہ! زاہدہ! کچھ تو بات کر دنا۔ دیکھو تم نے اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے۔ میں چپ تھی۔

زاہدہ! تمہیں میری جان کی قسم! کچھ تو بات کر دو۔

مگر مجھ سے بات ہی نہیں ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے مجھ سے قوت گویائی کی چھین لی ہے۔ ہونٹ کھولنے کی بھی سکت نہیں تھی۔

پھر وہ اٹھ کر میرے پاس آگیا اور میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ اور کہا:-

تمہیں اب کوئی حق حاصل نہیں۔ کہ تم مجھے یوں پیار کرو۔

کیوں؟

میں اختر کے سوا کسی سے شادی نہیں کر سکتی! لیکن اگر میری شادی اختر سے نہیں ہو سکتی۔ تو پھر میں کسی سے بھی نہیں کروں گی۔ پھر میں ساری زندگی شادی نہیں کروں گی۔ لیکن یا خدا! اس دادا جان کو تو ہی سمجھا میں کس کے آگے فریاد کروں!!

کل سے۔ . . . اور اب ہے۔ سردیوں کی ٹھنڈی اور تیز بارش! دادا جان کو بگڑت جانا تھا۔ مگر نہیں گئے۔ اب بارش تھمتے گی تو پھر جمانے لگے۔ ایک ایک لمحہ گن گن کر گزار رہی ہوں۔ یوں لگتا ہے۔ . . . جیسے یونہی جلتے جلتے مرنے جاؤں گی۔ بس ایک بار اختر سے ملنے اور دل کر ساری باتیں کرنے کی حسرت ہے۔ وہ پوری ہوئے تو پھر مرنے جاؤں گی۔ مجھ کو زندہ رہ کر کیا کرنا ہے!

دات دادا جان گجرات چلے گئے ہیں۔ آج میں اختر سے ملنے گئی۔ ان کے گھر میں کافی چپل پہن نظر آتی تھی۔ ہمان وغیرہ آئے ہوئے تھے۔ میں نے داپس آنے کا ارادہ کر لیا۔ مگر پھر سوچا کہ شاید پھر نہ آسکوں آج ہی بات کر کے جاؤں۔ اختر کے کمرہ کا دروازہ کھلا تھا میں اندر جا کر بیٹھ گئی اور کمرہ کو دیکھنے لگی۔ مجھے پچھلے سارے دن یاد آ گئے۔ اور سارے دنوں کے ساتھ ہی آنکھوں میں بے شمار آنسو آ گئے اتنے آنسو جو بچہ بغیر نہ رہ سکے۔ میرا دل بھر آیا۔ اور میں نے سسکیاں بھر بھر کر رونا شروع کر دیا۔

پھر ایک دم خیال آیا کہ اگر کوئی اور آگیا۔ تو! اور میں نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالنا شروع کر دیا کہ کچھ بھی تو نہیں ہوا کہ میں خواہ مخواہ پاگل ہو رہی ہوں۔ اتنے میں اختر آگیا۔ . . . مجھے دیکھ کر بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا۔ . . .

خدا کو اسی طرح منظور تھا۔ مجھ سے اس بے لگے کچھ نہ سنا گیا۔۔۔۔۔ مجھے اپنے چاروں طرف
بیاں چلتی نظر آئیں۔ اور میں نہ جانے کس مشکل سے واپس چل کر گھر آئی۔ اور پھر
بیوں میں ہی چکر کھا کر جو گری تو بعد کی ہوش نہ رہی۔

یہ اپنے دل سے پوچھو۔ یا ان لوگوں سے پوچھو۔ جنہوں نے میرے گھر میں بھلا
لگائی تھیں۔ اختر!۔۔۔۔۔ تم مجھے یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا
مگر تمہیں ایسا رویہ کبھی اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔

تم نے میرا جینا اجیرن کر دیا ہے۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تھا
کارن ہمارے گھر میں جو کچھ ہوا ہے۔ وہ تمہیں میں کبھی نہ بتا سکوں گی۔ نہ تمہیں اس کا احسا
ہو سکتا ہے ہماری زندگی تو پہلے ہی دکھوں سے بھری ہوئی تھی اختر! پھر تم لوگوں
نے ایسا ظلم کیوں کیا اختر!
مگر اختر نے قسم کھالی۔ کہ اسے اس واقعے کا کچھ علم نہیں ہے نہ اس کے گھر والے
لیے ہو سکتے ہیں۔

لیکن میرے دل کو یقین نہ آیا۔ بھلا ان لوگوں کے سوا اور کسی کو کیا علم تھا۔
لیکن میں چپ ہو گئی۔

کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر اختر نے بتایا کہ وہ مجھ سے بہت مجتہ
کرتا ہے۔ اور واقعی محبت کرتا ہے۔ لیکن شادی کرنا اس کے متعلق وہ اب کچھ نہیں
کہہ سکتا۔ کیونکہ اس نے گھر میں بہت زور لگایا تھا۔ مگر اس کی اتنی کسی طرح نہیں
رہیں۔ وہ اپنی بھتیجی ثمنہ کے ساتھ میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔

اختر یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔۔۔۔۔
موت کا سناٹا چھا گیا۔۔۔۔۔
مجھے اختر کے اس جواب کی ہرگز ہرگز توقع نہ تھی۔ میرا دل اتنی شدت سے دھڑکا
جیسے ابھی رک جائے گا۔

پھر کچھ دیر تک میں وہاں بیٹھی رہی۔ اور پھر اٹھ کر آنے لگی۔ اختر نے واسطے
دے کر کہا کہ خدا کے لیے حوصلے اور صبر سے کام لینا۔ اور ملنے ضرور آیا کرنا۔ میں بوجھ
ہو گیا ہوں۔ وعدہ کرو ملنے آؤ گی۔
دیکھو۔۔۔۔۔ غم نہ کھانا۔

آج کئی روز کے بعد ہوش آئی ہے۔ سارا جسم درد سے چور چور ہو گیا ہے
میرٹھیوں پر جب گرمی تھی۔ تو نیچے پانی کا گھڑا پڑا ہوا تھا۔ اس کے
ساتھ جا کر ٹکرائی۔۔۔۔۔ ہاتھ اور آنکھ کے قریب سے جگہ پھٹ گئی۔
کانوں سے خون بہنے لگا۔ بازو کے قریب شدید چوٹیں آئیں۔ بہت برا
حالی ہوا۔

اتنی سارا وقت روتی رہتی ہیں۔۔۔۔۔ سوچنے اور سمجھنے کی ہر قوت
جیسے جواب دے گئی ہے۔

کئی روز کے بعد آج بستر سے نیچے اُترتی۔ آئینہ میں چہرہ دیکھا۔ تو ڈر کر پیچھے
گئی۔ آج میں نے اپنا بستر اوپر دھوپ میں لگوا دیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر چارپائی
لگائی۔

آسمان گہرا نیلا ہو رہا تھا۔ اور بڑی ہی پیاری اور سنہری دھوپ چاروں طرف
ہوئی تھی۔ دن بڑا ہی روشن تھا۔

یہ سماں دیکھ کر نہ جانے کیا خیال جی میں آیا کہ سارا جسم لرز اٹھا۔ اور آنکھوں سے
پٹ آنسو گرنے لگے۔ آنسو یوں نامعلوم آواز میں گرتے رہے کہ پوچھنے کی بھی
نہ ہوئی۔۔۔۔۔

ایک دم دل میں خیال آگیا۔۔۔۔۔
میں کیا تھی؟ میں نے کہاں سے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ اور میں کہاں آگئی ہوں!!

بھی میں بھی معصوم تھی۔ تم جیسی ایک چھوٹی سی پیاری لڑکی تھی.....

..... میری سہیلیاں سنہنی خوشی کا بلج جاتی ہوں گی۔ اختر بھی بہت خوش خوش زندگی رہا ہوگا۔ اس کو مجھ سے کیا؟

اب تو نہیں جان سکتی..... نہ خدا کرے تو کبھی جانے! پھوپھی کے لڑکے نے آج چھٹی لی ہوئی ہے۔ ریڈیو لگا کر کمرہ میں بیٹھا ہے۔

کسی کا کچھ نہیں بگڑا..... اگر زندگی تباہ ہوئی ہے تو صرف میری.....

ماں جانتی ہے کہ مجھے کوئی روگ اندر ہی اندر کھا رہا ہے۔ اور اس خیال۔

ان کی جان بھی گھل رہی ہے۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ دادا جان میری شادی کرنا ہیں۔ وہ لوگ میری عیادت کو آئے تھے۔

نیچے پھوپھی نے نہ جانے ان کو کیا سکھایا ہے۔ کہ وہ منہ پھلکا کر یہاں بیٹھی اور پھر چلی گئیں۔ اللہ کرے! اب کبھی نہ آئیں۔

سمجھ میں نہیں آتا۔ زندگی کیسے بسر ہوگی؟ کیا ہوگا؟

نسیم میرا کس قدر خیال رکھتی ہے! بچاری ننھے ننھے ہاتھوں سے یہ سر روز دباتی ہے۔ کہتی ہے۔ حاجی! آپ کب اچھی ہوں گی! آپ کو ایسا بڑا چمک

کیسے آگیا کہ آپ ساری سیڑھیاں ہی گریں.....

میری بہن نسیم! میری چھوٹی ننی گریا! تمہیں کیا پتہ..... میں کہا سے گری ہوں؟

تو تو صرف سیڑھیوں پر سے کہہ رہی ہے۔ میں تو اپنی زندگی کی بلند ترین چوٹی پر سے گری ہوں۔ اور ایسی گری ہوں کہ اب کبھی نہ اٹھ سکوں گی..... یہ سیڑھی کی چوٹی تو چند روز کے بعد بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ مگر میرے دل پر جو چوٹ چمکی ہے اور جو زخم لگ گیا ہے۔ وہ دن بدن پھیلتے گا۔ ناسور بنے گا۔

اس کو کبھی آرام نہ آئے گا۔ یہ زخم کبھی مند مل نہ ہوگا۔ یہ تو میری زندگی کا نمک کو ہلا کر رکھ دے گا۔

یہ مجھے قبر میں اتار کر دم لے گا۔ یہ نہ جانے اور کس کس کو اپنی لپیٹ میں لے۔ تو تو ابھی معصوم ہے۔

سارا سارا دن اوپر چھت پر دھوپ میں لیٹی رہتی ہوں۔ چہرے کا رنگ سیاہی رہا ہے۔ کبھی آسمان کو تنکھی رہتی ہوں اور کبھی دیوار سے اکھڑی ہوئی پلستر کو گھورتی رہتی ہوں

لاش! میں کالج داخل ہو جاتی..... تو میرا جی کس قدر رنگ جاتا..... کچھ تو جاتا..... ہیلیوں میں اور پڑھائی میں محو ہو کر میں اختر کے سنجھے ہوئے علم کو بھول جاتی

کیا کروں! سارا وقت صرف اسی کا خیال دل میں سمایا رہتا ہے۔ اور مجھے دلا تارہتا

اختر نے مجھے کئی بار بلا بھیجا ہے۔ مگر میں نہیں گئی۔ میں نے اب کیا جا کر کرنا ہے! راج بھی ہوا اپنا جی لگاؤں گی۔ میں اسے بتاؤں گی کہ اگر تم مجھے آسانی سے بھلا بیٹھے

میں بھی تمہیں بھلا سکتی ہوں۔ میں کبھی اختر کو ملنے نہ جاؤں گی

دعا جو میرا رشتہ لے کر آیا کرتی تھیں۔ ان کو پھوپھی نے جل کر نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ دیا ہے کہ انہوں نے کہلا بھیجا ہے ہم نے کہیں اور منگنی کر لی ہے۔ اس خبر نے جہاں دادا جان کو دکھ پہنچایا ہے۔ وہاں مجھے بے اندازہ خوشی بخشی ہے پھوپھی اب اپنے لڑکے کو پیش کرنا چاہتی ہے۔ مگر میں بھلا کبھی اس سے شادی کر سکتی ہوں! کبھی نہیں کروں گی۔ میری زندگی تو پہلے ہی تلخ ہو چلی ہے۔ اور اب مزید کیا تلخ ہوگی۔

پھوپھی اس گھر سے چلی گئی ہے۔ مگر چونکہ دادا جان نے اس کے لڑکے سے رشتہ بن کیا۔ اس لیے جاتے ہوئے دادا جان کو کہہ گئی ہے۔ دیکھ لینا! تیری بیٹی کو سارے ذہان اور ساری برادری میں نشر کر کے چھوڑ دیں گی۔ اسے اس قابل نہیں رکھوں گی کہ کہیں شادی ہو سکے۔ پھر تو خود ہی سیریں سنیں کرے گا۔ اور یوں تجھے اپنے قدموں پر پڑا ادا کھوں گی۔

کتنی ذلیل عورت ہے۔ اسکا یہاں آنا بد نصیبی کے آنے سے کسی طرح کم نہیں۔ جب سے یہاں آئی تھی ہزاروں طرح کی اڑیاں کر داتی رہی تھی۔ اور اب جاتے تے بھی دھکی دے گئی ہے۔

یہ نیکی کا زمانہ ہے ہی نہیں۔ رہنے کو جگہ دے دی اور انعام یہ دے گئی ہے۔ اور اس نے تو ابھی نکلنا بھی نہیں تھا۔ دادا جان نے خود ہی اسے رخصت کیا۔

اس کا زردا بیٹا! انجم کو بری بری حرکین سکھا رہا تھا۔۔۔۔۔ اور ہمیں علم نہیں تھا۔۔۔۔۔

کل جب انجم روتا ہوا میرے پاس آیا کہ وہ جو نیچے آدمی رہتا ہے نا پھوپھی ساتھ؟۔۔۔۔۔ وہ مجھے اندر کوٹھڑی میں لے گیا تھا اور پھر۔۔۔۔۔ پھر اس بل ایسی بری بات بتائی کہ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ یہ بھلا کون ہو! میرے کو خراب کرنے والا!

میں نے اسی وقت دادا جان اور والدہ کو بتایا۔۔۔۔۔ اور دادا جان نے دوسرے دن پھوپھی کو نوٹس دے دیا کہ یہاں سے نکلنے کی تیاری کر دو۔ جہاں جی چاہے بیٹے کی شادی کر دو۔

اس بات پر بہت جھکڑا ہوا۔ اور نامراد عورت پھوپھی نے میرے وہ وہ طعنے جان کو دیتے کہ ہمسایاں توبہ توبہ کرنے لگیں۔

چار مہینے گزر گئے ہیں۔ میں نے گھر پر ایف اے کی کتا میں منگا کر پڑھائی شروع کر دی ہے۔ سعیدہ میری سہیلی کا لڑکے کے بعد روزانہ یہاں آ جاتی ہے۔ اور پھر ہم دونوں مل کر کام کرتی ہیں۔ اختر کا خیال کسی لمحے نہیں بھولتا۔ میں اپنے آپ کو ہر لمحہ مصروف رکھنے کی کوشش کرتی ہوں تاکہ اسے بھول جاؤں۔۔۔۔۔ سعیدہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی کہ تم کتنی کمزور ہو گئی ہو۔

اختر کو دیکھے چھ ماہ گزر گئے ہیں۔ پتہ نہیں وہ کس حال میں ہے!! لیکن میں بھی کتنی پاگل ہوں۔ خواہ مخواہ سوچ لیتی ہوں۔ جیسے شاید وہ بھی میرے بغیر اداس ہوگا۔

لیکن اس نے بھلا کا ہے کے لیے اداس ہونا ہے! وہ اچھا بھلا ہوگا! اے دل اب اسے بھول جا۔ ہمیشہ کے لیے بھول جا۔

دادا جان سارے گھر میں گالیاں دیتے پھرتے تھے اور میں اور والدہ بھی ہولی تھیں۔

اس وقت میرا جی کس طرح رو رہا تھا! جس شخص کے لیے بدنام ہو گیا جس شخص کے لیے زندگی کو روگ لگایا۔ وہ پھر بھی اپنا نہ ہوا۔ اور یہی وہ نازک اور دردناک وقت ہوتا ہے۔ جب محبت پھوٹ کر رہتی ہے۔

میں اس لمحے کس قدر ویران نہیں ہو گئی تھی میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔

اگرچہ آدھی ہمایوں نے یقین کیا تھا۔ اور آدھی ہمایوں نے یقین نہیں کیا تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ میں کیسی لڑکی ہوں۔ کبھی کو بھٹے پر جا کر یا کھڑکی میں کھڑے ہو کر تانک جھانک نہیں کی تھی۔

مگر پھر بھی یہ عورت میرا زخمی دل تو دکھا گئی نا۔ . . .

دادا جان کے دل میں تو برائی ڈال گئی نا

وہ پرانی وضع کے جاہل قسم کے آدمی ہیں۔ ایک پل میں گالیاں دینے پر اتر آتے ہیں۔

رات کو دادا جان آئے۔ تو میں ان کے سامنے ہی نہ ہوئی۔ ایک دور دراز تک

ان کا غصہ اتر جائے گا۔ میں ان کو سمجھا لوں گی

دادا جان کو بات سمجھا دی جائے۔ تو سمجھ جاتے ہیں

لیکن خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ وہ نامراد تو یہاں سے چل دی نا

ایسی عورتوں سے خدا بچائے۔ یہ تو شیطان کو بھی آگے لگاتی ہیں۔

آج میرا دل بہت ادا اس تھا۔ نہ جانے اختر کیوں بار بار یاد آ رہا تھا۔ اور ان کے ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ جب آنکھوں سے آنسو گرتے ہیں تو سارا جسم لرزنے لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ آنسو نہیں گرتے بلکہ خون نکلتا ہے۔

بھی پوسٹ نہ کر سکوں گی۔ اس لیے نہیں کہ یہ خط تم تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے کہ اب
یہ خط کھنے کا فائدہ ہی کیا؟

تم مجھے بھول چکے ہو گے۔ نئے چمکیلے رنگ سے تھینہ نے تمہیں اپنی طرف کھینچ
لیا۔ تم نے بھول کر خوشبو تمہیں پسند ہو گی۔ تمہارے دماغ پر چھاپ چکی ہو گی۔ اور تم مجھے کھیر
اوش کر بیٹھے ہو گے۔

کاش! تم ایک عزیز لڑکی کی محبت کو سمجھ سکتے!

میرا یہ انتظار بالکل فضول ہے۔ کہ شاید تم پلٹ آؤ۔ شاید تم واپس آ جاؤ۔ اور یہاں
اس اجڑے چمن کو ہر اکرویں۔ اور ہم ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے۔ زندگی کے طوفانوں
اس پار اتر جائیں۔

کاش! بے وفا اختر! تمہیں اس کا احساس ہو سکتا۔ کہ تم نے وفاداری کو کس بے رحمی
زہر پلایا ہے تم نے بھول کر پتی پتی توخ کر فضاؤں میں بکھیر دی ہے۔ مگر تم اتنی دور جا
ہو کہ اب تمہیں پکارنا بالکل فضول ہے۔ محبت کا چشمہ تمہارے دل میں سوکھ چکا ہے
ن درختوں پر اب کبھی پھول نہیں کھلیں گے۔

میری دنیا سے اب بہار رخصت ہو چکی ہے۔ درختوں نے افسردگی کا لباس اوڑھ
لیا۔

محبت کا چاند پہاڑیوں کے عقب میں غروب ہو چکا ہے۔ اب چاندنی محبت کے
بت نہ لگائے گی۔

تم! ایک بے وفائی ایہ صرف تم ہی وہ شخص ہو۔ پہلے اور آخری۔ جس سے
نہ محبت کی ہے۔ اور اس محبت کو دل سے نکال دینا میرے بس سے باہر ہے
کا پھول صرف ایک ہی بار کھلتا ہے۔ یہ سورج ایک ہی بار طلوع ہوتا ہے۔
اختر! تم نے اگر یوں چھوڑ دینا تھا۔ تو پھر میری معصوم جوانی کو محبت کے
سے کیوں بھرا تھا۔ میری زندگی اچھی بھلی گزر رہی تھی۔ تم نے مجھے کیوں بلایا
انے کیوں اپنا بنانے کا وعدہ کیا تھا۔

ایک خط! جو پوسٹ نہ ہو سکا! :-

اختر! تم سے ملے بغیر یہ دل کچھ یوں گزر رہا ہے۔ جیسے ان کا میری زندگی سے
دور کا بھی واسطہ نہیں۔ جیسے رنگین تصویروں کی کتاب دیکھتے دیکھتے اچانک بیچ میں ساؤ
اور سفید ورق آگئے ہوں۔ جیسے سینا دیکھتے دیکھتے ایک ایسی فلم ٹوٹ گئی ہو۔ آج نہ جانے
کیوں تمہاری ایک ایک بات تمہارے ساتھ گزرا رہی ہو۔ وہ حسین دن مجھے بڑی طرح
یاد آ رہے ہیں۔ جیسے میرے سامنے رنگین تصویروں والی فلم چل رہی ہو۔ جیسے میں
گہرے اندھیروں میں روشنیوں کے خواب دیکھ رہی ہوں۔ جیسے ڈراؤنے خوابوں کی جگہ
میں نے چمکیلے خوابوں کے ٹکڑے دیکھ لئے ہوں۔

اختر! بے وفا اختر! میں اکثر سوچتی ہوں کہ وہ پھول اب کیوں نہیں کھلتے۔ جوان دنوں
کھلا کرتے تھے۔ اور ویسا ہی چمکیلا سورج اب کیوں طلوع نہیں ہوتا! جو پہاڑوں کی بلند ترین
چوٹیوں پر نہایت آب و تاب کے ساتھ چمکا کرتا تھا۔ لیکن اب تو شام کے گہرے سائے
ہر طرف پھیل رہے ہیں۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر وہ قوس و قزح ہمارے آسمان پر دوبارہ
نہیں چھا سکتی۔ تو پھر ان دنوں کی سوگوار یاد کیوں باقی رہ جاتی ہے۔

شام کی اداسی چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ اور میں تمہیں یہ خط لکھ رہی ہوں۔ جو

لیکن تم تو یہ ساری باتیں بھول چکے ہو گے۔ تم مرد لوگ سارا کچھ آسانی سے فراموش کر دیتے ہو۔

کاش! میں بھی تمہیں بھلا سکتی!

اختر! ایک لڑکی کی زندگی کو خراب کرنے سے پہلے تمہیں یہ سوچ لینا چاہیئے تھا۔ جن وادیوں کو۔ جن ماہوں کو تم ملے نہ کر سکتے تھے۔ تم نے وہاں تم ہی کیوں رکھا۔

تم امیر لوگ ہو اختر۔ اور ہم غریب! تمہارے گھر دالے یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے۔ کہ تم ایک غریب لڑکی سے شادی کر دو.....

اختر! کاش! میں تمہیں اپنا دل چیر کر دکھا سکتی۔ کہ میرے دل کے سرستے ہوئے زخم پر تمہارا ہی نام کھدا ہوا ہے۔ تمہارے ہی گھاؤ لگے ہوئے ہیں۔ مگر تم اپنی ذرا سی بات کہہ کر میرے چاروں طرف دیرانیاں پھیلا کر چل دیتے۔

اور میں یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔ کہ مرد کی محبت ایک لمحہ میں بدل سکتی ہے۔

مرد جو کچھ کہتا ہے کبھی اس پر عمل نہیں کرتا۔ مرد کبھی وہ نہیں ہوتا جو اپنے آپ کو ثابت کرتا ہے۔

کاش! تمہیں معلوم ہو سکتا۔ کہ کس شدت کے ساتھ تمہاری پرستش کی جاتی تھی ہے۔

کاش! تمہیں اس کا ذرا سا بھی احساس ہوتا.....

تمہیں معلوم ہو سکتا۔ کہ محبت کتنی زبردست چیز ہے۔ محبت تو ایک ازلی و ابدی چیز ہے۔ یہ ایک آگ ہے۔ جو ایک بار روشن ہو جائے تو ریشے ریشے میں سرایت کر جاتی ہے۔ جو بجھنا نہیں جانتی۔ محبت دل کے چور و دروازوں سے داخل ہو کر کبھی رخصت نہیں ہوا کرتی۔

لیکن تمہاری محبت محبت نہیں تھی۔ تمہاری محبت "ہوس" تھی۔ تمہارا پیالہ

کی طرح اُٹا۔ آنا فنا میں چھا گیا۔ اور طوفان کی طرح چپ چاپ اتر گیا۔ اختر! تم نے مجھے ساری زندگی خون کے آنسو بہانے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتی! ... لکاش میں تمہیں بھول سکتی۔ میں تمہیں یونہی بے فائدہ خط لکھ رہی ہوں۔ جو تمہیں کبھی نہ بھیجوں گی۔ میں ایسے ہی لکھتی خط لکھ کر پھاڑ چکی ہوں۔ اب تمہیں خط لکھنے کا کیا فائدہ!

آج کا دن ایک عجیب اداسی میں گزرا۔ پیلی پیلی دھوپ اور آسمان پر چھائے ہوئے گہرے غبار نے سارے ماحول کو غلین بنا رکھا ہے۔ سردیوں میں پھیکے سے دھندلے دن کو جب بادلوں کے مٹاے ٹکڑوں نے سورج کو ڈھانپ رکھا ہو۔ اور چاروں طرف غبار کا گہرا خول ہو تو نہ جانے ایسے سے دل کیوں اداس ہو جاتا ہے۔

روح کسی بوجھ کے نیچے دبی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ساری دنیا غلین نظر آتی ہے جیسے کسی چیز میں بھی حسن۔ دل کشی اور رعنائی نہیں رہی۔ میرے لیے تو دیسے بھی دنیا میں نہ کوئی خوشی رہی ہے اور نہ حسرت رہا ہے۔ اب تو میں اختر کو بھی بھلا رہی ہوں۔

کرنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ خبر سنتے ہی میرے سارے جسم کو جھنجھوڑا لایا ہے۔
- میں بہت پریشان ہو گئی۔

اختر نے کس بے رحمی سے مجھے یادوں کے خزاں نصیب جنگلوں میں تنہا چھوڑ دیا
ہوا تھا۔ جہاں اس کی ہر بات ایک مستقل تہقنہ اور مذاق بن کر چاروں طرف پھیلی ہوئی
تھی۔ میں اس جنگل میں تنہا اور ماری ماری پھرتی رہی ہوں، بجز اور پتے ہوئے ریتے صحراؤں
میں دھنسی ہوئی تھی۔ میں نے وہ دن کس طرح بسر کیے تھے؟ میں نے وہ سال کس مشکل سے
گزارا تھا؟

اختر تم نے مجھے کس بری طرح مصیبتوں کے اس وسیع صحرائے تنہا چھوڑ دیا۔ کیا
تمہیں ذرا خیال نہ آیا تھا؟ تم نے اپنے کیے ہوئے وعدوں کا ایک لمحہ کے لیے بھی خیال نہ کیا۔
تم نے وعدوں کے سارے سینے ڈبو دیے۔ اور تم ٹھینے سے شادی کرنے کے
لیے تیار ہو گئے۔ تم ٹھینے کے خیال ہی سے وہ سارا کچھ بھول گئے۔ جب تم نے میرے ساتھ
ل کر آسمان کی لازوال مستقوں میں خواب دیکھے تھے۔ اور ستاروں کی دایوں میں پہنچ
کر محبت کے گیت گائے تھے۔ تمہاری محبت پانے کے بعد میں نے اپنی زندگی کے مرغزار پر
بنی ان پھولوں کو سنہری دھوپ میں کھلتے اور نکلتے دیکھا تھا جو اس سے پہلے کبھی نہ کھلے
صاحب بہت بیمار ہیں۔ انہیں بیمار ہوتے ہیں روز ہو گئے ہیں اور انہوں نے آپ
کو بلایا ہے۔

اس خبر نے مجھے شعلے کی طرح مضطرب کر دیا! میرا جی چاہتا تھا کہ اگر اختر بیمار
تو اس کی تیمارداری کرنے کا حق صرف مجھی کو ہے۔ میرا جی چاہتا تھا بھاگ کر جاؤں
اور اختر سے لپٹ جاؤں۔

وہ میری زخمی محبت جس کا گلا اس نے بے رحمی سے گھونٹ ڈالا تھا۔ آج
ایک ایسی بے چین ہو گئی۔ روشنی کے مینار کی مانند میرے تار یکے بعد دیگرے ابھر آئے
مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اسی پرانی محبت نے جس کا میں نے اپنے طور پر
میرے پاس وقت نہیں ہے اور وہ چلی گئی۔
اس کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک روتی رہی۔ میں کیوں اسے ملنے جاؤں؟
اور اس کا اب کیا ہوا تھا؟

وہ رنگ محل میں رہتا ہے۔ اور میں وہاں رہتی ہوں۔ جہاں خاک اڑتی ہے۔
زندگی میرے لیے ایک سنگین حقیقت بن کر رہ گئی ہے۔ اور اس کے لیے
محض ایک مذاق ہے۔ میرے ہر سمت اداسیوں کے کھنڈرات سلسلہ در سلسلہ
پھیلنے چلے گئے ہیں۔ اور اس کے گرد خوشیوں کے راگ ہیں۔
میں وہاں ہوں جہاں کوئی آواز نہیں۔ کوئی گیت نہیں۔ کوئی زندگی نہیں۔ داؤدوں
کا سورج ڈوب چکا ہے۔ پرندے گنگ ہو گئے ہیں۔
اب میں جا کر کیا کروں گی! لیکن نہیں میں جاؤں گی۔ اختر بیمار ہے
میں اسے دیکھنے ضرور جاؤں گی
یا خدا آج کا دن جلدی سے گزار دے۔ تاکہ میں کل جاسکوں اس وقت سہ پہر کے
چائے پچ رہے ہیں۔ اب نہ جاسکوں گی۔ کل جاؤں گی۔

ساری رات نہیں سو سکی اختر کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی
ہوں۔

آج میں اسے دیکھنے ضرور جاؤں گی جو رات جاگ کر دکھ کی
گزاری جائے وہ کس قدر لمبی رات ہو جاتی ہے! سو سال کی رات
ہو جاتی ہے۔
یوں لگتا تھا۔ جیسے کبھی صبح نہ ہوگی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ صبح ہو گئی
ہے۔

آج میں اختر سے ملنے گئی۔ ایک طویل مدت کے بعد ان کے ہاں گئی تھی۔
اختر کے کمرہ میں گئی۔ وہ کبیل اوڑھے سو رہا تھا۔ کمرہ میں اور کوئی نہ تھا۔
میں ڈرتے ڈرتے داخل ہوئی۔ کمرہ پر جا کر بیٹھ گئی۔ اب میں سوچ رہی تھی۔
اے اٹھاؤں کیسے؟
کیا کبیل کھینچوں! لیکن اگر کوئی اور ہوا تو؟
کیا اس کی آنکھوں پر ماتھ رکھ دوں!
لیکن میں خاموش بیٹھ گئی۔ بالآخر میں اٹھی۔ اور سر ہانے کی طرف جا کر جھک کر
بھنے لگی کہ اختر ہی ہے یا کوئی اور ہے؟

اور جوہنی میں جھکی۔ اختر نے دونوں ماتھوں سے میرا چہرہ کپٹ لیا۔ اور میرا منہ اپنے
کے پاس لے گیا میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے زبردستی اس کے ماتھ
اٹے اور وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا میں دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ اچھا بھلا
ما باکل بیمار نہیں تھا۔ بلکہ پہلے سے زیادہ صحت مند ہو گیا تھا۔

اس کو تندرست اور صحت مند دیکھ کر میرا جی اداس ہو گیا افسر وہ ہو گیا
. . . اور میرے دل سے بے اختیار دعا نکلی کہ کاش! یہ بیمار ہوتا! پھر میں اس کی نیازی

کر سکتی۔ اسے ملنے کے لیے آسکتی۔

ن کی بے دردی نے تو مجھے دکھ دیا ہے۔ اور اب یہی میرا درد کر رہا ہے!

یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے!..... نہ نہ اختر! تم میرا درد نہ کرو۔ تم صرف کرو۔ یہی تمہیں اچھا لگتا ہے۔

اختر نے بتایا کہ وہ اپنی اچی کو منارہا ہے کہ وہ یہاں شادی کرنا چاہتا ہے۔

اور اگلے ہفتے تک اس بات کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اس کی اس بات نے مجھے

ان کر دیا..... پھر اختر نے وعدہ لیا کہ میں اگلے ہفتے معلوم کرنے ضرور آؤں:

یہ ہفتہ ایک عجیب قسم کے موڈ میں گزر رہا ہے۔ عجیب شش و پنج میں کبھی آس بھجاتی تھی۔ کبھی نا اُمیدی ہو جاتی تھی۔ کبھی یہ خیال آ جاتا تھا کہ شاید وہ میری حالت بھ کر مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

لیکن اگر اس کے دل میں چاہ نہیں ہے۔ تو پھر میں یہ شادی نہیں کروں گی۔ میں تو شادی سے زیادہ یہ چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے اور صرف مجھ سے محبت کرے۔

شاید وہ میری حالت پر رحم کھا رہا ہے؛ خدا نہ کرے۔ اگر ایسی بات ہوئی۔ تو میں کبھی شادی ہی نہیں کروں گی۔ میں اس کا رحم نہیں چاہتی۔ مجھے رحم سے نفرت ہے۔ اگر اس نے مجھ پر رحم کیا تو فحش سے ڈانٹ دوں گی۔

میں کوئی فیکری ہوں۔ جو وہ مجھ پر رحم کر کے مجھے خیرات دے۔

اور تب! پھر شاید! اسے میری محبت کا خیال آتا.....

اختر مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا..... میں سوکھ کر ادھی سے بھی زیادہ کم

گئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اختر کے پاس پہنچ کر مجھے رونا آ جاتا۔ اس نے صرف اتنی سی باز

کہی۔ کہ یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔

اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔

مجھے خیال آ جاتا ہے کہ یہی تو وہ شخص بیٹھا ہے جس نے مجھے برباد کیا ہے۔

اداسی۔ میری تباہی..... میری غمگینی۔ میری کمزوری ہر چیز کا باعث صرف یہی

ہے۔ اس شخص کی محبت ہے جس نے میری زندگی کو دکھ میں بدل دیا ہے۔...

اور اب یہی شخص مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ تجھے کیا ہوا؟.....

کیا یہ رونے والی بات نہیں ہے؟

اس کے بعد بڑی مشکل سے اختر نے چپ کرایا..... بہت پیار کرنے!

بڑی باتیں کیں کسنے لگا۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھلا سکتا۔

میں تم سے محبت کرتا ہوں اور ہمیشہ کروں گا۔

اور میں نے ابھی تک ٹہنہ سے بھی شادی نہیں کی۔ میں وہاں شادی کرنا نہیں

چاہتا۔ میں تو صرف تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ تم جو میری محبت ہو.....

اس کے بعد پھر اختر ایک بار مجھے درغلانے لگا۔ کسنے لگا۔

میں تمہاری محبت کو آزمانا چاہتا تھا..... یہ دیکھنا چاہتا تھا..... کہ تم آتی

یا نہیں..... اور اگرچہ تم نے کل انکار کر دیا تھا۔ مگر مجھے پتہ تھا۔ تم آؤ گی۔

میں خاموش بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہی۔ میرے پاس ان باتوں کا کیا جواب

تھا!

اس نے کہا۔ وعدہ کرو۔ تم اپنی صحت کا خیال رکھو گی۔

اور یہ سن کر مجھے رونا آ گیا..... اختر کو بھلا میرا در کیسے آ گیا!

پرسوں اختر کے ہاں جانا ہے۔ پتہ نہیں۔ وہ کیا بتائے گا؟
خدا کرے..... وہ مجھے بہت بڑی خوشخبری دے۔

پھر میں اختر کے پاس ہمیشہ رات دن رہوں گی۔ پھر جدائی کے یہ ہولناک دن
جتنے میں نے گزارے ہیں۔ ان سب کی تلافی ہو جائے گی!
پھر دنیا کتنی خوبصورت ہو جائے گی؟..... پھر ہر چیز چمک اٹھے گی!
یا خدا!..... کیا تو میری اتنی سی آرزو بھی پوری نہ کرے گا؟

کل کی چاندنی رات کس قدر خوبصورت تھی۔ دُڑے دُڑے سے حُسنِ چشتی کے
مانند پھوٹا پڑتا تھا..... نیلی نیلی بے داغ چاندنی چاروں طرف کبھی جا رہی تھی.....
چاندنی کسی خوبصورت دوشیزہ کی طرح چمپ چاپ لیٹی ہوئی تھی..... ہر چیز
پر سحر انگیز کیفیت طاری تھی۔

میں مسحور سی ہو کر اختر کے متعلق سوچ رہی تھی؟ یہ کس قدر خوبصورت رات ہے!
جب شہروں کی گلیوں کے اندر یہ خوبصورت رات ہے۔ تو پہاڑوں اور جنگلوں میں یہ رات کیا
حسین نہ ہو جاتی ہوگی! میں ان پہاڑوں اور جنگلوں میں کب جاؤں گی! جہاں ایسی خوبصورت
چاندنی ہوگی! ایسی خوبصورت راتیں تو سو کر نہیں بسر کرنی چاہئیں۔

میرا جی چاہتا ہے میں چاندنی راتوں کا سارا حُسن اپنی بھولی میں سمیٹ لوں۔ ہائے میں
تو اس کی شدیدانی ہوں۔

ایسی راتوں میں بس یہی جی چاہتا ہے کہ چاندنی میں نہلنے ہوئے خوبصورت باغوں
میں جا کر رقص کریں۔ خوب اچھلیں۔ کودیں اور گائیں۔ شور مچائیں۔ اور آنکھ مچولی کھیلیں۔
مگر ایسا کہاں ہو سکتا ہے۔

ان جگہوں پر رہ کر ایسا سوچنا اور ایسے رنگین خواب دیکھنا لوگوں کے
نزدیک محض حماقت ہے۔ مگر میرے دل سے ایسی باتیں الگ نہیں
ہوتیں۔ بے شک چاہے یہ حماقت ہی کیوں نہ ہو!

آج میں اختر کے ہاں گئی۔ تو اختر گھر پر نہیں تھا۔ کچھ دیر کے بعد آیا اور اس کے ساتھ
لڑکی بھی تھی۔ اختر نے تعارف کروایا۔

یہ ہے مس ثینہ! میری پھوپھی کی لڑکی۔

اور یہ ہے مس زاہدہ سلطانہ۔ آسیہ کی بہیلی۔

ثینہ چمک کر سامنے صوفے میں جا دھنسی..... اس نے فیروز کی رنگ کی
جی باندھی ہوئی تھی۔ بال کٹے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر گہرے سرخ رنگ کی لب
۔ لگی ہوئی تھی..... بالکل خون کے رنگ کی۔ جیسے ابھی کسی کا خون پی کر آئی
۔۔۔ جیسے اس نے میرا ہی خون پیا ہے۔ میرے ارمانوں کا خون۔

میں خاموش زرد اور اداس چہرہ لیے بیٹھی تھی.....

اور اختر کبھی میری طرف دیکھتا تھا۔ اور کبھی ثینہ کی طرف.....

ثینہ شرم کر اسے دیکھ رہی تھی۔ ادائیں دکھا رہی تھی..... اور اختر اس پر
درہور رہا تھا.....

کچھ دیر کے بعد میں نے اختر سے اجازت مانگی کہ اب مجھے جانا ہے۔
ثینہ نے کہا کہ کچھ دیر بیٹھو۔ مگر میں کاہے کیے بیٹھی۔

میں اٹھ کر آگئی..... میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اگر اختر نے ثینہ سے
شادی کرنی تھی۔ تو پھر اس نے مجھے آج بلایا کیوں؟

مجھے یوں تنگ رہا تھا۔ جیسے اختر مجھے بے وقوف بنا رہا تھا.....

ثینہ کو دکھا کر یہ کہنا چاہتا تھا..... دیکھا..... میں جس سے شادی کرنا
بتا ہوں۔ وہ کیسی ہے؟

ہاں! اختر سچ کہتا ہے..... محبت یونہی نہیں کی جاتی۔

ایسی محبت میں آنسو نہیں بہاتے جاتے..... بلکہ آنکھوں میں
لڑکیوں کو خوبصورت بنایا جاتا ہے تاکہ دیکھنے والے کو اچھی طرح گھائی کیا جائے۔

ایسی محبت کرنے کے لیے لڑیٹی ساڑھی اور کٹے ہوئے بالوں کی ضرورت ہے۔
ناز و داد کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ دولت کی ضرورت ہے۔ آسودگی اور خوشی کی ضرورت ہے۔ رشتہ داری کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ لیکن یہاں بھلا کیا ہے؟
مثینہ وہاں رہتی ہے۔ جہاں پھول کھتے ہیں۔۔۔۔۔ جہاں سسکے کھٹکتے ہیں
جہاں لڑیٹی ساڑھیاں ہیں۔

مگر ہم وہاں رہتی ہیں۔ جہاں رک رک کر بہنے والے آنسو ہوتے ہیں۔ غریبی ہوتی ہے۔ اور باسی پھولوں کے مار ہوتے ہیں۔

کل تک اختر مجھے کہتا تھا۔ کہ ہمارا جنم جنم کا ساتھ ہے۔ اور آج وہ مثینہ سے کہہ رہا ہوگا۔ مجھ سے پہلے اور نہ جانے کس کس کو کہتا رہا ہوگا۔ اور نہ جانے کب تک کہتا رہے گا؟
کیا اختر اس قدر گھٹیا ہے!

میں نے جس اختر کو تاج محل کا ننگ مینا دیکھا۔ وہ تو مٹرک پر پڑا ہوا پتھر نکلا۔۔۔۔۔ اس کی محبت کا قطب مینا رنگین چٹانوں پر نہیں بلکہ ریت کی بوریوں پر تعمیر ہوا تھا۔ ان لوگوں کے لیے محبت تماش کے پتوں کی طرح ہے جسے ہر ایرے غیرے میں بانٹ دیتے ہیں۔

ساری رات میں ایک لمحہ کے لیے بھی نہ سو سکی۔۔۔۔۔ میری ساری روشنیوں میری آفریں آس ہر چیز گل ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ رنگوں کے دیپک بجھ گئے تھے۔ روشن چاند ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نامعلوم تاریکیوں میں جا چھپا۔

اور میں اپنے آپ کو اس قدر بڑھال محسوس کر رہی تھی جیسے ابھی گری کہ گری۔ بت بنی بیٹھی ہوں۔۔۔۔۔ پانگوں کی طرح چاروں طرف دیکھتی ہوں۔ نہ جانے کیا ہوگا؟ یہ صدمہ کیسے بھولے گا!

رات سے پھر بہت تیز بخار ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکلا جاتا۔۔۔۔۔ دادا جان کہہ رہے تھے۔۔۔۔۔ میری بیٹی کو نہ جانے کتنی نظر کھا گئی ہے۔

میرے دادا! کیا تو مجھ سے پیار کرتا ہے! کیا تو واقعی مجھے بیٹی سمجھتا ہے؟
ن بیٹی کو زہر لا کر دے دے کہ یہ مصیبتوں سے چھوٹ جائے۔

بخار اتار تا ہی نہیں۔ نہ زور کا چڑھتا ہے۔۔۔۔۔ نہ رات کو نیند آتی ہے۔
راسا پٹھلوں۔۔۔۔۔ تو دماغ تھک جاتا ہے۔
اتنی رات دن پریشان رہتی ہیں۔ کہ نہ جلنے ان کی بیٹی کو کون سا گھن لگ لیا ہے۔

مگر امی کو کیا پتہ؟!
زندگی کتنی عجیب ہو گئی ہے؟

کل میں ڈاکٹر کے ہاں سے واپس آرہی تھی۔ تو راستے میں اختر کا نوکر مل گیا۔ اس نے باک اختر بابو کی شادی اگلے اتوار کو ہو رہی ہے؟

اس خبر نے مجھے پاگل سا بنا دیا۔۔۔۔۔ بڑی مشکل سے ڈاکٹر کی دکان تک پہنچی اور ہڈھال ہو کر بیچ پر بیٹھ گئی۔ جیسے طوفان سے ٹوٹی ہوئی شاخ درخت ہوتی ہے۔ وہاں بے شمار عورتیں آئیں ہوئی بھتیجی مگر مجھے کسی کا کچھ علم نہیں کہ وہ کیا کہہ رہی تھیں۔ میرا رنگ لیون رح زدو تھا اور میری آنکھ میں کوئی آنسو نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے میرا بیکجہ کوئی کھارہا ہے اور بڑھ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سرد تھے اور جسم گرم تھا۔

بڑی مشکل سے گھر آئی۔ ڈاکٹر کی دوائی پی۔ اور بے سہ ہو کر پڑی۔

اے نیلے آسمانوں پر بسنے والے خدا! میری دنیا تباہ کر کے تیرے ہاتھ کیا آیا۔
کوئی خوشیاں مفت دے دی تھیں۔ جن کی قیمت لیٹی تھی؟

آج اختر نے شادی کا کارڈ بھیجا ہے۔ کہ اگر مجھے اس سے محبت ہے تو میں اس کی شادی میں ضرور آؤں۔

ادغام اور بے وفا شخص ایک تو چاہتا ہے کہ میں اپنے جنازے میں خود ہی شریک ہونے آؤں؟ کیا میں اپنے سامنے تیری شادی ہوتے دیکھ سکتی ہوں! تجھے یہ کارڈ بھیجتے ہوئے بھی کوئی خیال نہ آیا۔

تم میرا سہاگ مجھ سے چھین کر مجھے کفن پہنا رہے ہو! تم سارے لوگ پھتر ہو۔ تم بھی ایک پھتر ہو۔ مجھے ان پھتروں نے چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔ بہت جلد یہ سارے پھتر پھٹ جائیں گے۔ ریت چاروں طرف پھیل جائے گی اور یہ آندھی نہ جانے مجھے کہاں اڑا لے جائے گی۔

میں ریت کے اس طوفان میں نہ جانے کہاں کھو جاؤں گی۔ میرے بہن بھائی اور والدہ نہ جانے مجھے کہاں ڈھونڈتی پھریں گی۔ میں ان کو کہاں لوں گی؟

آہ! یہ ایسا غم نہیں جسے میں بھول سکوں گی۔ یہ اسی اختر کی شادی ہو رہی ہے۔ نے مجھے اپنی زندگی۔ اپنی جان کہا تھا۔ جس نے کہا تھا۔ زادہ! تم میرے جسم کا خون اور یہ پھول کی خوشبو ہو۔ تمہارے بغیر میں کبھی زندہ نہیں رہ سکتا! آہ! میں کس قدر بھوا بھلی اس کی باتوں پر یقین کر لیا۔

مگر وہ تو لفظوں کا سوداگر تھا۔ لفظوں کے مینا بازار سجا کر مجھے راستے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے زندگی بھر کا سودا چند جھوٹے اور کھوٹے سکوں سے بھی کم تر اور گھٹیا لفظوں پر یقین کر کے کر لیا۔ وہ تو کہتا تھا کہ میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے ہر بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرمول لے لوں گا۔

اور پھر وہ مجھے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیتا۔ اور کہتا کہ کوئی مجھے تم سے الگ نہیں کر سکتا میں گھبرا جاتی۔ میرا پانس رک جاتا تھا۔ مگر وہ مجھے نہیں

چھوڑتا تھا اس کے اس رویہ سے مجھے ڈر آتا تھا۔ کیونکہ اس طرح سارا کرتے ہوئے اس کی شکل بدل جاتی تھی۔ وہ کوئی ایسا خوشی درندہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ابھی ایک پل میں مجھے کھا جائے گا اور میں سہمی ہوئی ہر نی کی طرح اسے ٹکتی تھی اور جب میں اسے کہتی

اختر! یہ تمہیں کیا ہو جاتا ہے تمہارا جسم مانپنے کیوں لگس جاتا ہے۔ تمہیں بخار کیوں ہو جاتا ہے۔

تو وہ کہتا تم نہیں جانتیں۔ میں تم سے بہت زیادہ پیار کرتا ہوں اور جی چاہتا ہے تمہیں اپنے اندر اتار لوں۔ یا خود تمہارے اندر چلا جاؤں چند روز کے بعد جب تم میری بیوی بن جاؤ گی۔ تو پھر تم دیکھنا۔ جو میں نے ایک پل کے لیے بھی تمہیں چھوڑا۔ اس لیے کہ میں تم سے لازوال محبت کرتا ہوں۔ اور تم میری بیوی بننے والی ہو۔ میں تمہارا ملک اور شوہر ہوں۔

مگر اب وہ نیشن سے شادی کر رہا ہے کیا مرد کی محبت یہی ہوتی ہے۔ اس نے ایک معصوم لڑکی کی زندگی سے کھیلنا اور جب دل بھر گیا تو لا پرواہی اختیار کر لی۔

مرد کی محبت جب لڑکی کو چھو لے تو وہ ختم ہو جاتی ہے۔ اختر مجھ سے کبھی بھی محبت نہ کرتا تھا بلکہ وہ تو ایک عورت ایک جسم کو چاہتا تھا

اب اسے ایک اور جسم مل گیا ہے۔ ایک خوبصورت جسم۔ ریشمی ساڑھیوں میں لپیٹا ہوا وہ اسے بیوی کے روپ میں ملے گا وہ مجھ سے لا پرواہ ہو گیا ہے۔

بس اس کے سوا کوئی اور بات نہیں ہے۔ اختر نے مجھے جس قدر خوفناک دھوکہ دیا ہے جس بلندی سے گرایا ہے۔ میں اسے کبھی معاف نہ کروں گی۔ خدا اس سے ضرور بدلہ لے گا اس نے ایک ایسا دل توڑا ہے جو ہمیشہ سے دکھی تھا۔ دکھی دل محبت

کا بھوکا ہوتا ہے۔ اور میری محبت عظیم محبت تھی مگر اختر نے اسے پاؤں تلے کچل ڈالا :-

کل اتنی پانی کا اتنا بڑا گھڑا کھڑا کراد پر لارہی تھیں کہ سیر جھیلوں پر پاؤں پھسل گیا۔
ادردہ سیدھی نیچے جا گریں۔

گرنے کا دھماکہ ہوا۔ اور میری توجہ ان ہی نکل گئی۔ میں بستر کو چھوڑ کر بھاگی۔ داوا
جان بھی گھر پر نہیں تھے۔ ساتھ کی ہمسائی کو بلایا اور اتنی کو اٹھا کر ادھر لائے۔ ان کا چہرہ
ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اور آنکھیں بند تھیں۔ سیمہ نے رونا شروع کر دیا۔ انجم گھر
نہیں نکلا۔ میرا دل بہت تیزی سے دھڑکا۔ کیس میری اتنی کو تو نہیں کچھ ہو گیا۔
بڑی دیر کے بعد اتنی کو ہوش آئی۔۔۔۔۔ میری طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند
کر لیں۔

ایک پل میں ہی میری آنکھوں کے سامنے سے کئی تصویریں گزریں۔

مگر میں نے ایسے منحوس خیالوں کو اپنے پاس تک نہ پھٹکنے دیا۔

اور رات گئے تک اتنی کو سینک کرتی رہی۔ گرم دودھ پلایا۔ رات کو دادا جان آئے
تو ڈاکٹر سے دوائی لائے۔

اپنی بیماری مجھے بھول گئی ہے۔ اور اتنی کی تیمارداری میں مصروف ہو گئی ہوں
اتنی بہت بیمار ہو گئی ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کیا ہونے والا ہے؟۔۔۔۔۔

یا خدا! ہم پر رحم کرنا۔۔۔۔۔

اچھے خدا! ہم پر اپنا کرم کرنا۔۔۔۔۔ ہم سے ہماری اتنی کو نہ لینا میری
جان لے لے مگر اتنی کو آرام دے دے۔

راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعائیں مانگتی ہوں۔

یا خدا! ہمارا تصور مٹا کر دے۔

اتنی سے کروٹ تد نہیں بدلی جاتی۔۔۔۔۔ بہت زیادہ کمزور ہو گئی ہیں۔ ان
کو بیمار ہونے ایک مہینہ ہو گیا ہے۔ مگر آرام نہیں آتا۔ مجھے بھی بخار آتا ہے۔ مگر میری
اتنی کو آرام آجائے۔۔۔۔۔

نہ گھر میں کھانا پکتا ہے۔ نہ کوئی ہنتا ہے۔ بازار سے دونوں دقت کچھ نہ کچھ آ
جاتا ہے۔ میرا تو کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ صرف نسیم، انجم اور دادا جان کے لیے منگا
لیتے ہیں۔

یا خدا! تو امیر لوگوں سے ڈرتا ہے۔ ان کو کچھ نہیں کہتا۔۔۔۔۔ مگر تو نے ہم پر
کیوں اتنی سختی شروع کر رکھی ہے۔۔۔۔۔ پہلے تو نے ابا جان کو چھین لیا اور اب اتنی کو
آرام نہیں دیتا۔

یا خدا! میری جان لے لے۔ یا خدا! آج ہی لے لے مگر میری ماں کو آرام دے لے
میرے خدا میری اتنی کو لے کر ہم پر اور زیادہ سختی نہ کرنا۔۔۔۔۔

ہمارے پاس اتنا پوسہ بھی نہیں ہے کہ شاندار طریقے پر اتنی کا علاج کرائیں۔

ڈاکٹر بھی دس روپے فیس لیے بغیر نہیں آتا۔۔۔۔۔ اتنے اتنے قیمتی انجکشن وغیرہ
کہاں سے منگائیں؟!

مگر اتنی کو ضرور بچانا ہے۔

کیا میں اختر کو بتاؤں؟

لیکن نہیں۔۔۔۔۔ یا خدا! مجھے معاف کر دینا۔ میں نے خواہ مخواہ اس کا نام لے

یا۔۔۔۔۔ وہ ہمارا کچھ نہیں لگتا۔ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا لوں گی مگر اسے کبھی نہ کہوں گی۔ کہ
کیا بیمار ہے۔

نجمہ کو خط لکھوں! مگر ایک عرصہ سے اس کا بھی خط نہیں آیا

۔۔۔۔۔ نجمہ کو کیسے لکھوں!۔۔۔۔۔

کاش! وہ یہاں ہوتی!

میں اپنی ایف اے کی کتابیں بیچ ڈالوں گی مگر اس سے کیا ہوگا؟

یا خدا! تو میری ماں کو آرام دے دے۔ ورنہ ہم سب کو مار ڈال اکٹھے ہی ہم سب

اس دنیا سے اٹھائے۔ اپنی اس دنیا سے جہاں ہم دکھ اٹھانے کو زندگی گزار

ہے ہیں۔

آج اتی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ساری رات چارپائی کے ساتھ لگی اتی سے نظر بچا کر روتی رہی ہوں..... پاگل ہو گئی ہوئی لگتی ہوں۔
... اتی کے بعد سہا مارا کیا بنے گا؟

میری اتی جان! میری پیاری اتی جان..... اپنی آنکھیں کھول دے دیکھ میری اتی۔ تیری زائدہ بیٹی تجھے بلارہی ہے!
تو نے تو ابھی اس کی شادی کرنی ہے..... ابھی تو انجم اور نسیم نے بڑا ہونا ہے۔

میرے خدا میری فریاد سن۔ میری دعا قبول کر:

اتی کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ دادا جان خاموشی سے آتے ہیں اور چپ چاپ بیٹھ جاتے ہیں۔ اب نہ وہ گالیاں دیتے ہیں۔ نہ کسی سے بولتے ہیں۔ پہلے سے زیادہ بوڑھے ہو گئے ہیں.....
دادا جان کے ایک لپک کر کے پانچ جوان بیٹے مر گئے۔ پھر تین بیٹیاں مر گئیں اور اب..... ان کی بہو..... بستر علالت پر دراز ہے۔

یارب العزت! اسے پاک پروردگار! اسے میرے محبوب۔ آسمانوں پر بسنے والے خدا..... میری ماں کو آرام دے دے۔ ہماری مصیبتوں میں ہزار بار امانت کرنا۔ مگر ماں کو آرام دے دے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ ماں کے بغیر ہم کیسے زندگی بسر کریں گے۔ اور اگر تجھے نہیں پتہ..... تو پھر ہم کو پتھر کر دے۔ ہم سب کو اپنے بھی اداس اور تاریک نظر آتی ہے درخت پتوں سے خالی ہوتے جا رہے ہیں..... پاس بلا لے۔ ہم نے تیری دنیا میں رہ کر کیا کرنا ہے؟

یا خدا! ہم تیرے کھلونے ہیں۔ تو ہم سب کو ستا رہا ہے جو تیرا جی چاہتا ہے تو کرتا ہے تو امیروں سے ڈرتا ہے۔ ان کو کچھ نہیں کہنا.....
مارے ہم کو..... جو جی چاہے کرے
تو نہ جانے کب سنے گا؟.....

اتی کو وفات پانے ایک سال گزر گیا ہے۔ اور مجھے سینی ٹورم میں آئے چھ ماہ ہو گئے ہیں..... مگر پہلے سے زیادہ ہی بیمار ہو گئی ہوں۔

پہلے تو صرف ایک پھیپھاڑا جھلتی ہوئی اٹھا..... اب دوسرا بھی ہو رہا ہے..... ڈاکٹر لٹیاں دیتے ہیں۔ مگر میں ان کی جھوٹی تسلی سن کر سنسن دیتی ہوں..... میں جانتی ہوں کہ میں کتنے روز کی مہمان ہوں۔

اور اب جب کہ میں دن بدن مرنے کے قریب ہوتی جا رہی ہوں نہ مجھے کوئی دکھ رہا ہے۔ نہ غم رہا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں بہت جلد اتی اور آبا کے پاس جانے والی ہوں..... دادا جان پہلے ہی پہنچ چکے ہیں..... صرف ایک غم ہے..... میری نسیم بہن اور انجم بھینا کا کیا بنے گا؟

وہ فیصل آباد (لائی پور) میں حالہ کے پاس رہتے ہیں۔ وہ یہاں نہیں رہ سکتے۔ ان تین چار سالوں میں ہم پر کیا کچھ نہیں بتیا؟ مگر لگہ کیا؟
اب کوئی لگہ شکوہ نہیں ہے۔ کسی سے نہیں ہے۔ نہ خدا سے نہ دنیا والوں سے۔ اختر بھی نہ جانے کہاں ہو گا؟

آہ! میں نے اس پھول سے پیار کیا۔ جس کی خوشبو میں کبھی نہ سونگھ سکی۔ اور ان راستوں پر بیٹھی۔ جہاں سے اختر کبھی نہ گزرا۔

شام کی اداسی چاروں طرف چھا رہی ہے۔ سینی ٹورم کی اس اداس شام کا اندازہ لگنا..... اور پھر آج کل تو خزاں کا موسم ہے۔ جس کی وجہ سے فضا اور اگر تجھے نہیں پتہ..... تو پھر ہم کو پتھر کر دے۔ ہم سب کو اپنے بھی اداس اور تاریک نظر آتی ہے درخت پتوں سے خالی ہوتے جا رہے ہیں.....

سامنے کے درخت سے زرد زرد پتے ایک ایک کر کے گرتے رہتے ہیں۔ جیسے یہ میری یادیں ہیں۔ جو ایک ایک کر کے میری زندگی کے درخت سے بھڑکتی رہتی ہیں..... اور جب یہ درخت بالکل خالی ہو جائے گا۔ تو میں مرجاؤں گی۔ دنیا کی باتیں۔ یادیں سارا گھر یہیں چھوڑ جاؤں گی۔

دور سیاہ پہاڑیوں کے پیچھے زرد آفتاب غروب ہو رہا ہے ابھی کچھ دیر کے بعد

چاند کالی کالی ٹہنیوں کے پیچھے سے نکل آئے گا۔ اور میری ختم ہوتی ہوئی زندگی کا ایک اور روز کم ہو جائے گا۔ ایک دن اور بیت جائے گا۔۔۔۔ موت کی گھڑی اور قریب آ جائے گی اب مجھے موت سے بالکل ڈر نہیں لگتا۔ موت میری پہلی ہے۔

موت ہی مجھے اپنے گھر میں پہنچا دے گی۔ ایسے گھر میں جہاں میرے آبا اور میری اتنی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں اپنی اتنی اور آبا کے پاس اپنے گھر میں رہنا چاہتی ہوں یہاں اس دنیا میں بالکل اکیلی ہوں۔۔۔۔ پھر میں یہاں کیسے رہ سکتی ہوں۔ جوں جوں موت کے قریب ہوتی جاتی ہوں۔ آخر سے ملنے کی خواہش بڑھتی جا رہی ہے مگر میں اسے نہیں ملوں گی مجھے کیا خبر کہ وہ کہاں ہے؟

وہ زندہ ہو گا۔۔۔۔ اور زندگی کی ہر خوشی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہو گا۔۔۔۔ دنیا میں ایسے ہی لوگوں کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ خدا نے انہی لوگوں کے لیے زندگی بنائی ہے۔

ورنہ وہ ہمارا گھریلو نہ اجاڑتا۔۔۔۔

پہلے ہمارے آبا کو لے لیا پھر غریبی دے دی۔ پھر اتنی کو لے لیا۔ پھر دادا جان کو اور اب میری باری ہے۔ کچھ روز کے بعد نسیم اور نجم کی بھی باری آ جائے گی۔ ان دونوں کو بھی بخار رہنا ہے۔ کاش! یہ دونوں میرے سامنے مر جاتے۔

دونوں خالہ کے پاس رہتے ہیں۔ جو رات دن ان سے کام لیتی ہو گی۔۔۔۔۔ اور کھانے کو کیا دیتی ہو گی۔۔۔۔ میں تو چاہتی ہوں کہ خالہ زیادہ سے زیادہ ظلم کرے۔ تاکہ یہ جلد سے جلد ہم سے آن ملیں۔ میں ان کو دنیا میں عزیزوں کے گھر چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی میں ان کو ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ جن بچوں کے والدین دنیا میں نہ رہیں۔ دنیا انہیں اپنے پاؤں تلے کچل ڈالتی ہے۔ اپنے ظلم کا نشانہ بنا ڈالتی ہے۔۔۔۔ یہ دنیا میں ظلم سمجھنے کیلئے کیوں زندہ رہیں؟

میری معصوم کلیو! میرے بہن بھائیو! میرے قریب آ جاؤ۔۔۔۔ ان دنوں میں تو میرے پاس رہو۔

روزانہ ڈائری لکھتی ہوں۔۔۔۔۔ ڈاکٹر سے چھپ چھپ کر۔۔۔۔۔ آدھی سے زیادہ ڈائری کھو گئی ہے۔۔۔۔۔

کاش! میں تندرست ہو جاتی۔۔۔۔۔ تو اپنی داستان خود لکھتی۔ مگر۔۔۔۔۔ اب نہیں لکھ سکتی۔۔۔۔۔ جو کھا تھا۔ وہ بھی آدھے سے زیادہ کھو چکا ہے۔ میرے مرنے کے بعد سب لوگ ان کو پڑھیں گے۔ شاید کسی کو آخر کا پتہ چل جائے۔۔۔۔۔ اور وہ بھی جان بے پیمان لے۔

لیکن اگر اسے پتہ بھی چل گیا۔ تو کیا ہو گا؟ اسے تو جیتے جی میری پرداہ نہ ہوئی تو اب کیا ہو گی؟

آہ!۔۔۔۔۔!!

ڈاکٹر اشفاق روزانہ آتا ہے۔ کس قدر سنسن مکھ اور مہربان ڈاکٹر ہے۔۔۔۔۔
مجھے کتنی تسلی دیتا ہے۔۔۔۔۔ مجھ سے کتنی کتنی دیر تک باتیں کرتا رہتا ہے میرا
جی بہلاتا ہے۔ وہ مجھے ٹھیک کرنے کی ہر ہر کوشش میں مصروف ہے۔
لیکن میں کیسے ٹھیک ہو سکتی ہوں؟۔۔۔۔۔ میں اسے کیا بتاؤں۔۔۔۔۔ کہ اختر کا غم
مجھے کھا گیا ہے۔ ایک مرد نے غم دیا ہے اور دوسرا مرد غم کو مندل کر رہا ہے۔۔۔۔۔
دیکھیں کون کامیاب ہوتا ہے۔ اختر کا غم بھاری رہتا ہے۔ یا ڈاکٹر اپنی کوششوں میں
کامیاب رہتا ہے۔

ڈاکٹر مجھ سے کہتا ہے کہ اپنے دل کی ہر بات مجھے بتا دو۔ مگر کیسے بتاؤں؟۔۔۔
میں کبھی نہ بتاؤں گی۔ اب یہ راز میرے منہ سے نہیں نکل سکتا۔ ٹال۔ اگر وہ میری یہ
ڈاکٹر سی پڑھ لے تو پڑھ لے۔
لیکن یہ بے ربط ڈاکٹر سی۔۔۔۔۔ کسی کو بھلا اس کی کیا سمجھ آئے گی؛
اور پھر اگر کسی کو سمجھ آجی گئی تو کوئی محسوس کرنے والا ہی محسوس کرے گا۔۔۔۔۔ عام لوگ
بھلا کیا سمجھیں گے۔

کل یہاں ایک لڑکا آیا۔ وہ اپنی بہن کے ساتھ آیا تھا۔ اس کی بہن کی سہیلی
یہاں بیمار ہے۔ اسے دیکھ کر میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ اس کی شکل بالکل
اختر سے ملتی ہے۔

اور میں اس کے جلنے کے بعد رات گئے تک روتی رہی۔ بغیر آنسوؤں
کے روتی رہی۔ اب میں آنسوؤں سے تو کبھی نہیں رو سکتی۔ اب بغیر
آنسوؤں کے روتی ہوں۔

شاید وہ کل پھر آئے۔ وہ ضرور آئے۔ میں اسے ضرور دیکھنا چاہتی ہوں

سینی ٹوریم میں بستر پر لیٹے لیٹے جب کھانستے کھانستے مدھالی ہو جاتی ہوں۔
تو اٹھ کر ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی ہوں۔ دور دور تک بستر پر لیٹیں پڑے ہوئے ہیں۔
کبھی کبھی سوچنے لگ جاتی ہوں۔۔۔۔۔ کہ نجانے ان میں سے کتنوں کو حق کس
وجہ سے لگی ہوگی!!۔۔۔۔۔

پھر جی چاہتا ہے۔ ان سب سے ان کے حالات پوچھوں اور ان سب کو
لکھوں اور پھر دنیا والوں کے سامنے پیش کروں کہ دیکھو!۔۔۔۔۔ تمہارے ظلم کے
نشانے کہاں کہاں تک پہنچتے ہیں۔

کیا پتہ ان میں سے کئی لڑکیوں کو محبت کی وجہ سے وق ہوئی ہو۔
کیا خدا ان سے خون کا بدلہ لے گا!۔۔۔۔۔ یوں کوئی کسی کو قتل کر دے تو فوراً پھانسی
کی سزا دی جاتی ہے مگر اس طرح ہزاروں لوگوں نے ہزاروں لڑکیوں کو۔۔۔۔۔ لڑکوں
کو ظلم کر کے اندر ہی اندر گھٹن لگا کر موت کے گھاٹ پہنچا یا ہوا ہے۔ ان کا بدلہ کیوں
نہیں لیا جاتا! ظلم کرنے والوں کو سزا کیوں نہیں دی جاتی! یہ کیسا انڈھا انصاف ہے!!۔۔۔۔۔
اور خدا سارا کچھ دیکھتا ہے۔ اوچپ رہتا ہے۔ خاموش رہتا ہے۔

آج اس کی بہن آئی ہے۔ مگر وہ نہیں آیا۔ کیا میں اس کی بہن سے پوچھوں؛ لیکن نہیں۔ میں کسی سے نہیں پوچھتی۔ میں کسی سے نہیں پوچھوں گی۔ جب زندگی ختم ہو رہی ہو۔ اور موت کا سفر شروع ہونے والا ہو۔ تو ایسی باتوں سے کیا فائدہ؟

یہاں کے اکثر بیمار مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم کو ملنے والا کوئی نہیں آتا۔ اور میں ہنس دیتی ہوں۔ میں ان کو کیا بتاؤں؟ کہ مجھ سے ملنے کے لیے کس نے آنا ہے؟ مجھ سے ملنے والے تو اس جہان میں پہنچ چکے ہیں۔ جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔۔۔۔۔ اب ان سے ملنے کے لیے میں ان کے ہاں جاؤں گی۔ آخر کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ یہاں آئے۔ اے دنیا والو! میں بہت جلد تم کو الوداع کہنے والی ہوں۔ یہ بخار اور یہ کھانسی۔۔۔۔۔ یہ مجھے چند دنوں کے بعد ختم کر دیں گی۔۔۔۔۔ پھر میں آسمانوں کی طرف چلی جاؤں گی۔۔۔۔۔ نہ جانے دوسری دنیا کیسی ہوگی!

کہ میرا ایک بھائی بالکل میری طرح ہے۔ جتنی کہ اتنی شکل ملتی ہے کہ لوگوں کو دھوکہ ہو جاتا ہے۔ مگر اس نے یہاں کیا کرنے آنا ہے؟

آج کا دن کتنی خوشی کا دن تھا! آج میں نے اپنی سہیلی نجمہ کو دیکھا ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر رونے لگ پڑی۔۔۔۔۔ اس کے پاس ابھی آنسوؤں کا ذخیرہ موجود ہے۔ خدا کرے اس کی آنکھوں سے آنسو کبھی نہ بہیں۔ میری آنکھ سے اب ایک بھی آنسو نہیں نکل سکتا۔ وہ بہت دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ کتنی مہربان ہے! کتنا افسوس کرتی تھی کہ متاثری یہ حالت کیسے ہو گئی؟ اور میں نے اسے کہا۔ نہیں پھر بتاؤں گی؟

اور پھر کھانسی شروع ہو گئی۔ اور کوئی بات نہ ہو سکی۔ نجمہ روزانہ آتی ہے مجھ سے بات تک بھی نہیں ہو سکتی۔ وہ طرح طرح کی باتیں کر کے میرا جی بہلاتی ہے۔ ڈاکٹر سے باتیں کرتی رہی۔ مگر۔۔۔۔۔ میں بھلا کیسے ٹھیک ہو سکتی ہوں؟

نجمہ نے بتایا کہ باجی کی شادی کے بعد اب اس کی شادی ہونے والی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ میں جلد ہی اچھی ہو جاؤں تاکہ اس کی شادی میں آسکوں۔ نجمہ کتنی بھولی ہے۔ بہت زیادہ!! بھلا میں کبھی ٹھیک ہو سکتی ہوں!

آج اس کے جانے کے بعد میں تقریباً نیم بے ہوش سی پڑی اور یہی سوچتی رہی۔۔۔۔۔ کہ ہم لوگوں میں اور ان لوگوں میں کیا فرق ہے؟ ہم نے کون سا گناہ کیا تھا۔ جس کی سزا یہ مل رہی ہے۔ کہ میں سینی ٹورم

آج وہ لڑکی اور وہ لڑکا پھر آیا تھا۔۔۔۔۔ میں کبسل کی اوٹ سے کتنی ہی دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ بالکل آخر کی طرح لگ رہا تھا۔۔۔۔۔ کہیں یہ آخر کا بھائی ہی تو نہیں ہے؟۔۔۔۔۔ آخر کہا کرتا تھا۔۔۔۔۔

میں سسک سسک کر جان دے رہی ہوں۔ اور انہوں نے کون سی نیکی
کی تھی۔ کہ امن۔ خوشحالی اور خوبصورتی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ اور اب
اس کی شادی بھی ہوگی! یہ کس کا ہاتھ ہے۔ جس نے اسے خوشی بخشی ہوگا
ہے۔ اور ہمیں دکھ!
اس راز کو کہاں سے پاؤں!

آج! میری حالت زیادہ خراب ہے۔ آج یوں لگتا ہے۔ جیسے زندگی کی
آخری رات ہے۔
کاش! میں اپنے بہن بھائیوں سے مل سکتی! پھر شاید میں مرنے سکتی۔!
کتنا اچھا ہو۔ جو میں مرنے سے پہلے بے ہوش ہو جاؤں۔ میں
یہ ڈائری وغیرہ منجھ کے نام کر کے اسے بھجوا دوں گی۔
میرا دل ڈوب رہا ہے۔ اور آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں :-

زاہدہ کی ڈائری پڑھنے میں میں اس قدر محو ہوئی تھی کہ مجھے وقت کا پتہ ہی نہ
چلا۔ اور جب میں نے ڈائری بند کر کے رکھی۔ تو میں پھوٹ پھوٹ کر
رونے لگ پڑی۔

اور پھر چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔
سارے گھر والے اکٹھے ہو گئے تھے۔ پھر جب مجھے ہوش آیا۔ تو اختر میرے
پاس بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے اسے دیکھ کر منہ نفرت سے دوسری طرف پھیر لیا۔ میرا جی پٹا
تھا کہ میں اس شخص کو زندگی بھر نہ دیکھوں۔

یہ اختر میرا منگیتر جس کے ساتھ میری منگنی دو سال پہلے ہوئی تھی۔ . . .
تمینہ سے اختر کا بیاہ نہ ہو سکا تھا۔ تمینہ کی ماں نے شادی سے چاہ
روز پہلے وہ طوفان کھڑا کیا تھا۔ کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں۔

جب میں زاہدہ کی ڈائری پڑھنے کے بعد بے ہوش ہوئی تھی۔ تو وہ ڈائری
کھلی کی کھلی پڑی رہ گئی تھی۔ اور میرے بے ہوش ہونے کے بعد سارے
گھر والوں نے اسے پڑھ لیا تھا۔ اختر نے بھی پڑھ لیا تھا۔ . . .

اور اب وہ مجرم بنا بیٹھا تھا۔۔۔۔۔
 سب گھروالوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کوئی کسی کو کیا کہے؟
 اور یہ آخر ہی تھا۔۔۔ جو سینی ٹوریم میں جاتا رہا تھا۔۔۔۔۔ مگر افسوس کہ
 زاہدہ سے بات نہ کر سکا۔۔۔۔۔
 کاش! زاہدہ ایک بار اس سے بات کر لیتی۔

پاکستانی وقتا
 ڈاٹ کام